Regd. A466

# نگار

سالانہ چندہ پاکستان وہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

ہندوستان وپاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

# تصانیف نیاز فتحپوری

## ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینوالی انجیل انسانیت

## من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

## مذہبی استفسارات و جوابات کا

## مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ہارون حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۴۴ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے

## نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

## جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے۔
علاوہ محصول

## حسن کی عیاریاں

### اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

## ترغیبات جنسی یا

### شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

نیا اڈیشن قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

# پہلے اسے پڑھ لیجئے

## (خریداران نگار کے لئے نہایت ضروری اطلاع)

ہر مہینے نگار نہایت احتیاط سے ہر خریدار کے نام روانہ کیا جاتا ہے پھر بھی بعض پرچے ڈاک کی بدنظمی یا
می ڈاکیوں کی بے پروائی کی وجہ سے گم ہوجاتے ہیں۔ ہم کو جب اس کی اطلاع ملتی ہے تو ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے
ن اس کا کوئی علاج نہیں اس لئے ہم اطلاع ملنے پر دوبارہ پرچہ روانہ کردیا کرتے تھے، لیکن اب محکمۂ ڈاک کے
ید قواعد کی رُو سے نگار کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی سات مقرر کردی گئی ہے اور اس کے بعد ایک پیسہ کی جگہ ہمکو
ڑھ آنے کا ٹکٹ لگانا پڑے گا۔ یہ صرف بہت زیادہ ہے لیکن اگر اسے برداشت کرلیا جائے تو بھی یقینی نہیں
رچہ دوبارہ آپ کو ملجائے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ پرچہ بیرنگ روانہ کیا جائے جو تین آنے
رنے پر آپ کو ملے گا، اس طرح پرچہ آپ کو یقینی مل جائے گا۔

آپ اپنے مقامی ڈاک خانہ اور پوسٹ مین کو بھی ہدایت کرتے رہئے کہ وہ احتیاط سے آپ کی ڈاک آپ تک
پاتا رہے تاکہ اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ پرچہ آپ کو نہ پہونچے اور دوبارہ بیرنگ وصول کرنا پڑے۔ منیجر

---

# پاکستان کے خریدارانِ نگار

اپنا چندہ آٹھ روپیہ چھ آنے (چھ آنے زاید سالنامہ کے رجسٹرڈ بھیجنے کے ہیں) ذیل کے پتوں میں سے کسی پتہ
یلر سلسلۂ خریداری جاری رکھ سکتے ہیں — اگر آپ نے ۶ر زاید نہ بھیجے تو ہم سالنامہ کے پہونچنے کے ذمہ دار
ں گے اور دوبارہ مُفت روانہ نہ کرسکیں گے۔

ڈاکٹر ہاشمی - ۲۲۲، الٰہی بخش کالونی کراچی ——— ۲- ملک دین محمد اینڈ سنز بُل روڈ لاہور

---

# احباب پاکستان ہماری مطبوعات حاصل کرنے کے لئے

فیروز سنز بندر روڈ کراچی سے مراسلت فرمائیں

منیجر نگار

## نگار کا سالنامہ ۵۴ء

# (فرمانروایانِ اسلام نمبر)

جن خصوصیات کا حامل ہوگا، ان کو مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ایک دائرۃ المعارف ہے جس کے مطالعہ کے بعد آغاز عہد نبوی سے اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے متعلق آپ کو معلوم ہوسکے گا کہ وہ کب، کہاں اور کن حالات میں قایم ہوئیں، ان کے عروج و زوال کے کیا اسباب تھے، ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں کیونکر منتقل ہوئیں، ان کے فرمانرواؤں کے کیا نام تھے اور ان میں سے ہر ایک نے کس سنہ سے کس سنہ تک حکومت کی۔

اس سالنامہ میں دو نقشے ایسے بھی شامل ہوں گے جو پورے سالنامہ کا نچوڑ ہیں اور جن کو دیکھ کر بیک نگاہ اسلامی حکومتوں کے عروج و زوال کی پوری تصویر آپ کے سامنے آجائے گی۔

قیمت فی کاپی علاوہ محصول تین روپیہ۔ خریدارانِ نگار کے لئے مُفت، لیکن چھ آنے زاید مصارف رجسٹری کے لئے آنا ضروری ہیں۔

منیجر


---

### اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم ہو رہا ہے

تو مناسب یہی ہے کہ آپ جنوری ۵۴ء میں سالنامہ کی وی پی کا انتظار کریں جو سات روپئے آٹھ آنے میں روانہ ہوگا، لیکن اگر آپ چندہ پیشگی بھیجنا مناسب سمجھتے ہیں تو ازراہ کرم منی آرڈر آٹھ روپیہ چھ آنے کا روانہ فرمائیے تاکہ سالنامہ ذریعہ رجسٹری روانہ کیا جائے، ورنہ گم ہونے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مُفت روانہ نہ کرسکیں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

### اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۳ء میں ختم نہیں ہوتا

تو ایک لفافہ کے اندر چھ آنے کے ٹکٹ رکھ کر سالنامہ کی رجسٹری کے لئے ضرور بھیج دیجئے۔ ورنہ گم ہونے کی صورت میں ہم دوبارہ اسے مُفت فراہم نہ کرسکیں گے بلکہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ۶ر ذریعہ منی آرڈر بھیجیے کیونکہ دونوں صورتوں میں آپ کے آٹھ آنے صرف ہوں گے اور منی آرڈر کا پہونچنا بالکل یقینی ہے۔ لفافہ کے اندر ٹکٹ رکھے ہوئے ممکن ہے ہمیں نہ مل سکیں۔

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے
نگار آٹھ روپیہ سات آنے میں وی، پی ہوگا

# نگار

اس امر کی کہ آپ کا چندہ نومبر میں ختم ہوگیا اور دسمبر کا
جس میں سالنامہ ۵۴ء کی قیمت بھی شامل ہے

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۴ | فہرست مضامین نومبر ۵۳ء | شمار ۵

ملاحظات ---------- ۳
ایران کی سیاسیات حاضرہ کا اہم ترین پہلو --- "ایران دوست" ۵
سلیمات حالی کا ایک جایزہ ---- رشید حسن خاں --- ۱۹
یونس کا سیاسی فکر و شعور ---- ل - احمد ---- ۲۸
ن تحریر کی تاریخ ---- محمد اسحاق صدیقی -- ۳۶
ہے گا ہے باز خواں (ہمارے بتکدے اور ان کے لات و ہبل) ۴۰
عورتیں ہی عورتیں ---------- ۴۴
دعوتِ نقد و نظر ---- نظیر صدیقی - اکرم دھولیوی --- ۴۷
منظومات --- فضا ابن فیض - ساقی جاوید - نظیر صدیقی - اکرم دھولیوی ۵۲
قلق کی غیر مطبوعہ رباعیاں ---- عابد رضا خاں بیدار --- ۵۴
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۵

# ملاحظات

## مولانا سیّد سلیمان ندوی اور پاکستانی حکومت کا تصور

پاکستان کے مسئلہ دستور سازی کے سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا دلچسپ بیان حال ہی میں شایع ہوا ہے

آپ فرماتے ہیں کہ:- (۱) پاکستانی حکومت کا نام "جمہوریۃ شوریٰ اسلامیہ" ہونا چاہئے - (۲) حکومت کا مذہب اسلام قرار دینا چاہئے اور (۳) دستور میں اس امر کا کافی تحفظ ہونا چاہئے کہ آیندہ کسی وقت بھی اسے سیکولر (لادینی) حکومت نہ قرار دیا جاسکے ورنہ دہریت کا سدِّ باب نہ ہوسکے گا

مولانا نے پاکستان کو صرف "جمہوریت پاکستان" کے نام سے موسوم کرنا غالباً اس لئے پسند نہیں کیا کہ لفظ "جمہوریت" ان کے نزدیک شاید شوریٰ یا "تشاور وافی الامر" کا مفہوم شامل نہیں ہے اور اسی لئے انھوں نے شوریٰ کا اضافہ ضروری سمجھا، لیکن اس اضافہ کے بعد انھوں نے سوچا ہوگا کہ مذہب کی تخصیص تو باقی رہ گئی، اس لئے انھوں نے لفظ اسلامیہ کا اضافہ فرمایا —— لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ یہ نام رکھ کر آیندہ خطرات سے ہمیشہ کیلئے

محفوظ ہو گئے ـــــ غالباً نہیں، کیونکہ اسلامیہ کی تخصیص کے بعد بھی یہ سوال قدرتاً پیدا ہو سکتا ہے کہ اسلام سے کیا مراد ہے اور ہم صحیح معنے میں کس کو مسلمان کہہ سکتے ہیں

خیر احمدی جماعت کو چھوڑئے کہ وہ غریب تو بالاتفاق ہمیشہ کے لئے غیر مسلم قرار ہی دیدی گئی ہے، لیکن اسکے علاوہ بھی تو اسلام میں اور بہت سے فرقے ہیں:۔ حنفی، مالکی، حنبلی، شافعی، شیعی، معتزلی، خارجی وغیرہ، ان میں سے کسی ایک کو معیار قرار دینا پڑے گا اور چونکہ پاکستان میں حنفی جماعت کی اکثریت ہے، اس لئے مولانا کو حنفیہ کا اضافہ بھی کرنا چاہئے تھا۔ اس کے بعد انھیں یہ غور کرنا چاہئے تھا کہ حنفی جماعت بھی مختلف العقاید گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور اس میں اہلِ قرآن، اہلِ حدیث، مقلد، غیر مقلد وغیرہ سبھی شامل ہیں، اس لئے مقلدین کی اکثریت کے پیشِ نظر "تقلیدیہ" کی شرط بھی انھیں بڑھانا چاہئے تھی۔ مگر یہ سلسلہ اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتا، کیونکہ مقلدین کے بھی متعدد خانوادے ہیں اور چونکہ ان میں مولانا اشرف علی تھانوی کا خانوادہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور پاکستان میں اس کے تنہا نمایندہ خود مولانا سید سلیمان ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے حکومت پاکستان کا نام رکھنے میں ذرا انکسارِ نفس سے کام لیا، ورنہ اس کا صحیح نام ہماری رائے میں یہ ہونا چاہئے تھا:۔

"الجمہوریت الشورۃ الاسلامیۃ، الحنفیۃ، التقلیدیۃ، الاشرفیۃ، السلیمانیہ" اس کے بعد وہ اگر چاہیں تو "فبای آلاء ربکما تکذبان" کا بھی اضافہ فرما سکتے ہیں۔

---

## ڈاکٹر مصدق کا عروج و زوال

اس ماہ کی اشاعت کا سب سے پہلا مقالہ جو "ایران کی سیاسیات حاضرہ" اور ڈاکٹر مصدق کے غیر متوقع سقوط سے تعلق رکھتا ہے۔ میرے ایک عزیز دوست کا عطیہ ہے جو عرصہ سے طہران میں اقامت پذیر ہیں اور وہاں کی سیاسیات پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں، یہ مقالہ اس میں شک نہیں بہت اہم ہے نہ اس لئے کہ وہ ایک ایسے شخص کا بیان ہے جس نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ایرانی قوم کا سچا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

جن حضرات نے نگار کا سالنامہ ۱۹۵۱ء ملاحظہ کیا ہوگا ان سے مخفی نہ ہوگا کہ مارس ہینڈس نے ایران کی سیاحت کے بعد وہاں کی اقتصادی زبوں حالی کا ذکر کن درد انگیز الفاظ میں کیا تھا اور اس نے یہ پیشین گوئی کردی تھی کہ آج نہیں تو کل یہاں کی آبادی میں اپنی خواری و ذلت کا صحیح احساس پیدا ہوگا اور اس کا ردِ عمل یہ ہوگا کہ موجودہ دورِ "ملوکیت" ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔

ڈاکٹر مصدق کا ظہور اسی پیشین گوئی کی پہلی کڑی تھی اور اس کا سقوط اس کی دوسری کڑی ہے۔

ہو سکتا ہے بعض نفوس، ڈاکٹر مصدق کی ناکامی کو ایران کی "شاہنشاہیت" کی کامیابی قرار دیں لیکن وہ حضرات جو زمانہ کے نبض شناس ہیں جانتے ہیں کہ:ـــ "ایں خستہ اگر دیر زید شام بمیرد" ـــــ مصدق کے زوال ہی میں ایرانی قوم کا عروج پنہاں ہے اور اس خاکستر سے اب جو چنگاری بلند ہونے والی ہے وہ نہ صرف ایران بلکہ تمام مشرق وسطیٰ کے نظام استعمار کو خاک میں ملا کر رکھ دے گی ـ

گر غبار آلودہ گشتی باک نیست
اے ہزاراں دیدہ در راہِ تو خاک!

اس مقالہ کا باقی حصہ تمام و کمال آیندہ پرچہ میں شایع کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ڈاکٹر مصدق کی قسمت کا فیصلہ جو کچھ ہونا ہے اس کا علم قارئین نگار کو اخبارات کے ذریعہ سے خود ہی ہو جائے گا۔

---

# ایران کی سیاسیات حاضرہ کا اہم ترین پہلو

## تیل کے مسئلہ میں برطانیہ کی ریشہ دوانیاں

### ایرانی وزیر اعظم ڈاکٹر مصدّق کا عروج و زوال

۱۹ر اگست ۱۹۵۳ء کو ایران کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق کی (۲ سال ۸ ماہ) کی "مضبوط قومی حکومت" کا ناگہاں سقوط تاریخ ایران کا ایسا عجیب و عبرتناک واقعہ ہے جس کی بابت آیندہ کا مورخ معلوم نہیں کن لفظوں میں اظہار رائے کرے گا ۔ راقم کہ جس نے اس جمی جمائی ہوئی بساط کو اپنی آنکھوں سے دفعتًا اُلٹ جاتے ہوئے دیکھا ہے، اس کے متعلق صرف یہ کہہ سکتا ہے جیسے کوئی چیز دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ایک ماہر تیراک ہولناک موجوں سے جنگ کرتا، گرداب سے کتراتا، طوفان سے لڑتا جھگڑتا ساحل تک آجاتا ہے کہ دفعتًا پانی کا ریلا آتا ہے اور اُسے بہاکر کہیں سے کہیں لیجاتا ہے ۔ ۔ ۔ ڈاکٹر مصدق اور اُس کی قومی حکومت کا بھی یہی ہوا ۔ ۔ ۔ اور ایک بالکل جیتی ہوئی بازی دفعتًا ہار میں بدل گئی ـــــ یہ بازی کیا تھی ـــــ ؟ مختصراً یوں سمجھئے کہ ایران کے مشہور قضیۂ نفت (تیل) کے سلسلہ میں مصدق کی ساری کوشش یہ تھی کہ وہ تیل کے موضوع کو ایک عظیم الشان مسئلہ بناکر اُس کے پردے میں پہلے عوام کو انگریزوں کے خلاف اُبھارے اور پھر ان کی مدد سے ایران کی چھ ہزار سالہ شاہی حکومت کا تختہ اُلٹ کر ملک میں جمہوریت کی بنیاد ڈال دے ـــــ یہ بازی کس کے ہاتھوں خراب ہوئی ـــــ ؟ اس کی اکثریت کے خیال کے مطابق اس کے سبب دو ہیں :-

اول مصدقی حکومت کے ۳۴ سالہ، ناتجربہ کار، وزیر خارجہ ڈاکٹر حسین فاطمی کا ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل !

دوم ایران کی تودہ (کمیونسٹ) پارٹی کی احمقانہ جلد بازی !

**ڈاکٹر حسین فاطمی** ایرانی سیاست کے افق پر حسین فاطمی کا ظہور بھی ایک دلچسپ واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاطمی حکومت سے زیادہ سے زیادہ ایران کے پڑھے لکھے درمیانی طبقہ کا ایک فرد کہا جاسکتا ہے ڈاکٹر مصدق کے حکومت سے پہلے اس شخص کو ایران کے پایۂ تخت طہران میں بھی کوئی شہرت حاصل نہیں تھی۔ یہ ایک ذہین نوجوان تھا اخباروں میں مضامین لکھکر اپنی روٹی کماتا تھا۔ جب مصدق کے آفتاب اقبال کی روشنی زیادہ پھیلنے لگی تو اس موقع پرست ہزار آنکھوں والے اڈیٹر نے اپنی طباعی اور فراست سے بوڑھے اور شریف باطن مصدق کا دل کچھ اس طرح ہاتھ میں لے لیا کہ رفتہ رفتہ مصدق کے رفقاء خاص میں اُس کا شمار ہونے لگا۔ پہلے فاطمی نے مصدق کی مالی امداد سے "باختر امروز" نام کا ایک روزنامہ اخبار نکالا۔ یہ اخبار پُرزور لہجہ میں حکومت کی پالیسی کی حمایت کرتا، ملک میں انگریزوں کے خلاف قومی جذبات کو اُبھارتا اور ایشیائی ممالک کو اتحاد و یگانگت کی دعوت دیتا۔ یہ وقت وہ تھا جب ایرانی قومی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ مصدق اور اسکے وطن پرست رفقاء نے مل کر "حزب نہضتِ ملی" (National Front Party) کے نام سے ایک سیاسی پارٹی قایم

کی ۔ اس پارٹی کا پروگرام یہ تھا کہ ایرانی تیل کے کارخانہ کو (جو دنیا میں تیل صاف کرنے کا سب سے بڑا کارخانہ سمجھا جاتا ہے) قو
بنائے اور ایران کی سرزمین سے برطانوی سیاست کے اقتدار کو ختم کردے ۔ فاطمی اس جماعت کا سرگرم ممبر بن گیا۔ ڈاکٹر مصد
اور ایران کے مشہور مجتہد آیت اللہ ابوالقاسم کاشانی دونوں نے انگریزوں کے خلاف محاذ قایم کر دیا — اُس وقت یہ دو
سیاسی اور مذہبی پیشوا فکر و نظر کے اعتبار سے ایک جان دو قالب معلوم ہوتے تھے ۔ فاطمی کو دونوں کا اعتماد حاصل تھا
باختر امروز کی بدولت فاطمی کی سوشل اور سیاسی اہمیت روز بروز ترقی پر تھی۔ یہاں تک کہ اُس کا تقرر وزیر اعظم مصدق کی
سیاسی پارلیمانی سکریٹری اور "سخنگوئے دولت" ( Govt. Spokesman ) کی حیثیت سے ہوگیا۔
کافی اہم عہدہ تھا جو فاطمی کو نصیب ہوا۔ لیکن وقت اور قسمت نے اُسے آگے بڑھایا۔ ایرانی مجلس (پارلیمنٹ) کا
دو سالہ انتخاب شروع ہوا۔ فاطمی اس انتخاب میں مصدق اور آیت اللہ کاشانی کی حمایت سے بھاری ووٹوں سے منتخب
ہوا، اور مجلس کا ممبر بن گیا۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب ملک میں سیاسی طوفان برپا تھا اور قومیت کا سیلاب ٹھاٹھیں
مار رہا تھا۔ اس عالم میں فاطمی جیسے عامی اور کم عمر شخص کا اس بلندی پر پہونچ جانا کھلے طور پر تو حسد اور اعتراض کی
نگاہوں سے نہیں دیکھا گیا لیکن خواص اور امراء کے طبقہ میں اکراہ اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی ۔ ایرانی پارلیمنٹ کے دونوں
ایوانوں (دارالامراء اور مجلس شورائے ملی کے قدامت پرست حلقوں) میں اس انتخاب کو شرمناک سمجھا جانے لگا اور عوام
میں بھی سرگوشیاں شروع ہوگئیں ۔ لیکن علانیہ کہنے کی جرائت کوئی نہ کرسکتا تھا ۔ مصدق کے جاہ و جلال کا سورج اپنی
پوری تابانی پر تھا۔ اس انتخاب میں اور بھی کئی افراد ایسے آگئے اور اس سے طبقۂ امراء میں جنھیں ایرانی "اعیانہا" معاملہ
کہتے ہیں، کھلبلی سی مچ گئی "دربار شاہی" کے حلقہ میں بھی اندیشہ کا اظہار ہونے لگا ۔ وہ صاف صاف دیکھ رہے تھے کہ ملک
کی حکومت جو ہزاروں سال سے خواص کے زیر اثر تھی، اب عوام کے ہاتھوں میں جارہی ہے ۔ مگر ایسے تمام افراد مصدق کی
ہر دلعزیزی کے آگے اپنے کو یکقلم بے بس اور مجبور پا رہے تھے ۔ مصدق ملک کا "محبوب" اور ملت کا "باپ" تھا ۔ اس کے
خلاف کوئی حرف سننا "کفر کے برابر" تھا اور اُسے بُرا کہنے والے کی سزا قتل ۔ مصدق کے صدقہ میں فاطمی کا شمار بھی "نہضت
ملی" کے لیڈروں میں ہونے لگا ۔ لیکن فاطمی جیسے معمولی بساط کے آدمی پر مصدق کے عنایات و اکرام کی بارش بعض حلقوں
کے لئے ناقابل برداشت ہو رہی تھی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر ایک جلسہ میں جبکہ وہ تقریر کر رہا تھا، فروری ۱۹۵۲ء میں گولی
چلائی گئی ۔ مگر وہ اس مہلک حملہ سے اپنی جان سلامت بچالے گیا ۔ حملہ کا ذمہ دار اُس نے انگریزوں کو ٹھہرایا۔ دو ماہ کے
معالجہ کے بعد جب وہ اسپتال سے باہر نکلا اور تبدیل آب و ہوا کے بعد یورپ کی سیاحت سے واپس آیا تو اس نے اپنے کو
ایرانی وزارت خارجہ کی گرانوقار مسند پر متمکن پایا —!

سنجیدہ اور تعلیم یافتہ ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد کا عقیدہ ہے کہ مصدق کا یہ انتخاب کسی اعتبار سے مناسب نہ تھا
کسی حلقہ میں بھی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ۔ جس نے بھی یہ خبر سُنی اُسی نے حیرت کا اظہار کیا ۔ مصدق کے
دورِ حکومت کا واقعہ نگار اس کا اعتراف کرے گا کہ یہ ایک بڑی غلطی تھی جو مصدق سے سرزد ہوئی اور جس کی قیمت اُسے
اپنے خوابوں کی مکمل پامالی کی صورت میں ادا کرنا پڑی ۔ معاملہ کا سب سے زیادہ درد انگیز پہلو یہ ہے کہ مصدق کو یہ شکست
اُس وقت اُٹھانی پڑی جب وقت کا ہاتھ اُس کے سر پہ کامیابی کا تاج رکھنا چاہتا تھا۔

## جنگ کے بعد ایران کا قومی اضطراب

نامناسب نہ ہوگا اگر ڈاکٹر مصدق کے ظہور و زوال کی کہانی کو مسلسل و مربوط شکل دینے کے لئے ایک سرسری نگاہ اُس کے وزیر اعظم بننے
جانے سے قبل کے حالات پر بھی ڈال لی جائے ۔

دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام کے بعد ایران کی سیاسی تاریخ لمحہ بہ لمحہ ملک کی بڑھتی ہوئی اقتصادی بدحالی کی سے نہایت ہیجانی دور سے گزرتی رہی ہے۔ ایرانی مجلس (پارلیمنٹ) میں ملک کی مالی حالت کی ابتری اور عوام کے ناک مصائب و آلام پر اضطراب کا اظہار کیا جاتا، اقتصادی تیرہ بختی سے ملک کو نجات دلانے کے لئے جہاں اور سری قسم کی تدبیریں تجویز کی جاتیں وہاں سب سے زیادہ زور ایرانی تیل کی آمدنی پر بھی دیا جاتا جس کا بڑا حصہ ۱۹۳۳ء ایرانی۔ انگریزی تیل کے معاہدہ کی رو سے انگلستان کی تجوری میں جا رہا تھا۔ وطن پرست ممبرانِ مجلس اس معاہدہ کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کرتے اور اسے ملک کی نکبت و فلاکت کا سب سے بڑا سبب بتلاتے۔ انھیں یقین کہ انگریز صرف ایران کے خدا داد منبع طبیعی (تیل) ہی کا مالکِ حقیقی نہیں بلکہ سارا ملک اس کے سیاسی اقتدار اور لی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس گرفت کی سختی جنگ دوم کے بعد زیادہ بڑھ گئی اور مرحوم رضا شاہ بلا وطن کرنے کے بعد صحیح معنوں میں انگریز ہی ایرانی سرزمین کا اصلی آقا و مالک بن گیا۔

تمام وطن پرست اور انقلاب پسند لیڈروں کو یقین تھا کہ حکومت کی بساط پر اُسی مُہرہ کو شاہ و وزیر کی جگہ ل ہے جو انگریزوں کے اشاروں پر چلتا اور ملکی مفاد کے خلاف اُن کے خود غرضانہ مقاصد کی حمایت کرتا ہے۔

ضمناً یہ بھی ذکر کر دینا مناسب ہے کہ ہندوستان، پاکستان، برما، انڈونیشیا وغیرہ کی آزادی نے انگریزوں کے خلاف اس جوش و خروش، بے خوفی اور بغاوت کے جذبہ کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا تھا۔ ان نو آزاد ممالک کے بیت انگیز افسانے، ایرانی قومی تحریک کی آگ پر تیل کا کام کر رہے تھے سارے ملک کا مزاج مشتعل ہو رہا تھا دل میں انگریزوں کے خلاف بغض و عداوت کا طوفان برپا تھا۔۔۔۔۔۔۔ نئی نئی سیاسی جماعتیں اور پارٹیاں ہوتی جا رہی تھیں۔

انھیں طوفانی ایام میں دو بہت اہم قومی پارٹیاں وجود میں آئیں۔ ایک مصدق کی حزب نہضت ملی۔ دوسری ده پارٹی۔ رفتہ رفتہ دوسری سیاسی یا نیم سیاسی نیم مذہبی پارٹیاں بھی قایم ہوگئیں۔ جن میں حزب پان ایرانسٹ حزب فدائیانِ اسلام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ بعد میں ایک اہم پارٹی نیروئے سوم کے نام سے بھی قایم گئی۔ اس کا رجحان سوشلزم کی طرف ہے۔ یہ ساری جماعتیں اپنے اپنے جداگانہ داخلی پروگرام رکھتی تھیں لیکن ال تک ملک کے جسم سیاست (Body Politics) سے انگریزی رسوخ و اثر کو نکال پھینکنے کا سوال ما سب کی سب اس مخصوص نصب العین میں متحد و ہم آواز تھیں۔

دُنیا کے تمام کمیونسٹوں کی طرح تودہ پارٹی کا نعرہ بھی یہی تھا کہ انگریزوں کے ساتھ ساتھ امریکی اثر و نفوذ کو بھی ایران ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہئے۔ تودہ پارٹی ایران کی سب سے زیادہ منظم، سرگرم اور جانباز پارٹی سمجھی جاتی ہے خیال یہ ہے کہ روسی سفارت اس پارٹی کی سرپرستی کرتی ہے۔ اس کا پروگرام یہ ہے کہ ایران سے شاہنشاہیت کو ختم کر کے وِیٹ نظام حکومت قایم کیا جائے جو روسی کنٹرول میں ہو یا اُس سے باہر۔ منجملہ اور باتوں کے اس کا پروگرام یہ بھی کہ اگر انقلاب سے ممکن نہیں تو بادشاہ کو گولی کے ذریعہ صفحۂ ہستی سے دور کر دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء کے ایک جلسہ موجودہ شاہ پر گولی چلائی گئی۔ اُس وقت سے یہ پارٹی قانونی طور پر ناجایز قرار دیدی گئی ہے۔ لیکن اس کی خفیہ گرمیاں بدستور باقی رہیں۔

حزب فدائیانِ اسلام نے اپنا مذہبی وظیفہ یہ قرار دیا کہ وہ ملک کے "خائنوں" اور "غداروں" کو چُن چُن کر عدم آباد پہنچا دے اور ایران میں شریعت کے اصول پر ایک خالص قسم کی "عبا و عمامہ" والی اسلامی حکومت قایم کر دے۔ یہ

پارٹی مغربی تہذیب کی دشمن اور رضا شاہ کے سوشل اصلاحات کی مخالف ہے۔ طہران کے کوچہ و بازار میں شراب اور سور کے گوشت کی علانیہ فروخت اسے پسند نہیں۔ ایرانی عورتوں کی ترقی پسندی اور اُن کی "فرنگیمانہ بے حجابی" اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اسی جماعت کے ایک "فدائی" خلیل طہماسپی نے ۱۹۵۱ء میں ایرانی وزیر اعظم علی رزم آرا کو "طرفدار انگلستان" ہونے کے جرم میں طہران کی ایک مسجد میں قتل کر ڈالا جبکہ وہ کسی شخص کی نماز میت پڑھ کر واپس آرہا تھا۔ ملک کے جوش و جنون کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ مصدق کے دور حکومت میں ممتاز سیاسی لیڈروں کے دباؤ اور سفارش سے طہماسپی پر سے قتل کا مقدمہ اُٹھا لیا گیا۔ ایرانی مجلس کی متفقہ رائے میں وہ بے گناہ قرار پایا۔ مقامی اخباروں سے اُسے "قومی مجاہد" کا خطاب ملا۔ وزیر اعظم مصدق نے اسے سراہا۔ مذہبی پیشوا آیت اللہ کاشانی نے اسے رہائی کے بعد مبارکباد دی۔ ملک کے فیاضانہ چندوں سے وہ عتبات عالیہ کی زیارت سے مشرف ہوا!!

علی رزم آرا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سلجھا ہوا سیاست داں اور ٹھنڈے غور و فکر کا آدمی تھا۔ اسکا دو ٹوک فیصلہ یہ تھا کہ ابھی ایران اپنے تیل کے کارخانہ کے چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اُسے انگریزوں کے سہارے کی بہرحال ضرورت ہے۔ ایک طرف تو وہ انگلستان کا دوست مشہور تھا۔ دوسری طرف روس سے بھی اُس کے سیاسی تعلقات خاصے گہرے تھے۔

## وزیر اعظم کے عہدہ پر مصدق کا انتخاب

رزم آرا کے قتل کے بعد ملک کی سیاسی فضا نے نہایت پراگندہ اور بحرانی صورت اختیار کرلی۔ شاہ کے لئے سب سے بڑا اور پیچیدہ سوال یہ تھا کہ ملک کا وزیر اعظم اب کسے مقرر کیا جائے۔ آشوب اور اختلال ملک کے گوشہ گوشہ میں حکم فرما تھا۔ نہضت ملی کے لیڈر اور ان کے ساتھ ساتھ تودہ کی ممنوع جماعت کے غوغائی اس شورش و بدنظمی کی آگ کو اپنی اشتعال انگیز تقریروں سے اور بھی ہوا دے رہے تھے۔ ہر وہ فرد جو اُن کی انجمن کا حامی یا اُن کے گروہ کا فرد نہ ہوتا اُس کے پاؤں جمنے نہ دیتے۔ دہشت انگیزوں ( Terrorists ) کے خوف سے حکام کے دل لرزتے رہتے تھے۔ امراء کا شمار انگریزوں کے "خادمانِ خاص" میں ہوتا۔ وہ ملک کے بہت بڑے دشمن سمجھے جاتے۔ معروف اور ممتاز سیاسی شخصیتوں میں شاید کوئی ایسا نہ تھا جس کا دامن رشوت خواری اور ملک فروشی کے اتہام سے پاک ہو۔ غرض عوام کی نگاہ میں ایسا کوئی نہ تھا جسے قوم بے غرض اور سچا خادم وطن سمجھ کر قبول کرلے۔ اس طرح کی عام بے اعتمادی، شکوک اور بدگمانی کی فضا میں اگر کوئی شخص ایسا موجود تھا جس کا ماضی بیقلم بے داغ اور جس کی پچھتر سالہ زندگی کا دامن خود پرستی اور خیانت کے داغ سے یکسر پاک سمجھا جاتا، تو وہ فقط ڈاکٹر محمد مصدق تھا۔

یہ عام طور پر مشہور ہے کہ خود ایک بڑا زمیندار اور ثروت مند ہونے کے باوجود مصدق نے ہمیشہ سیدھی سادی زندگی بسر کی اور ہرچند وہ کئی بار وزیر اور گورنر کے عہدوں پر مامور ہوا لیکن مادی حرص و ہوس کی آلایش سے اُس کا کیرکٹر ہمیشہ پاک رہا۔ خود اس کے مخالف اس کی دیانت و پاکبازی کے معترف ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ موجودہ ایران میں کسی ایسے شخص کا پایا جانا معجزہ سے کم نہیں۔ ایران کی زبردست اکثریت کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ مصدق وطن کا سچا خیرخواہ اور دردمند ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مصدق کی حزب نہضت ملی نے چند ہی مہینوں میں حیرت انگیز فروغ حاصل کرلیا۔ مصدق مجلس کا رکن تھا۔ یہاں بھی اُس کا اثر روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ ملک کی اقتصادی اور مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے اُس کی پارٹی نے جو پلان تیار کئے تھے اس کے پسند کرنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہوتا جارہا تھا۔ اس جماعت کا پروگرام جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا، یہ تھا کہ:- (۱) ایرآن کے تیل کی صنعت کو قومی بنایا جائے۔ (۲) ۱۹۳۳ء کے ایرانی، انگریزی عہدنامہ

قرار دیا جائے۔ (۳) انگریز ایرانی تیل کے کاروبار میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو اُن کی حیثیت حقیقی معنوں میں صرف ایک شریک کار کی ہو، مالک اور آقا کی نہیں، جیسا کہ اب تک رہا ہے۔ زمین سے تیل نکالنے اور دُنیا کے بازار میں اُس کے بیچنے کا انتظام براہ راست ایرانیوں کے ہاتھ میں رہے وغیرہ وغیرہ۔

تودہ پارٹی جس کا سیاسی عقیدہ اور پروگرام مصدق کی نہضتِ ملی پارٹی سے بالکل جداگانہ تھا، اس معاملہ خاص میں مصدق جماعت کی ہمنوا بن گئی تھی اس لئے کہ سردست دونوں کا مقصود ایک تھا یعنی انگریزی استعمار کو ایرانی سرزمین سے ہمیشہ کے لئے اُکھاڑ پھینکنا — جب کبھی انگریزی یا مغربی استعمار کے خلاف کوئی احتجاج یا مظاہرہ ہوتا تو تودہ افراد شوق درجوق آتے اور ایک آواز ہوکر نعرے سر کرتے۔ ان ہنگاموں میں کبھی کبھی "برچیدہ باد سلطنت" کے نعرے بھی سننے میں آجاتے۔ اس عام قومی بیداری سے تودہ پارٹی اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور مصدق جماعت ذرا بھی مزاحم نہ ہوتی تھی بلکہ در پردہ ہمت افزائی کرتی ---- اور ہمت افزائی اس لئے کرتی کہ تودہ پارٹی حزب نہضتِ ملی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ منظم، مرتب اور طیار جماعت تھی۔ یہ جس حزب سے مل جاتی اس کی قدرت وقوت کو دوگنا مضبوط کر دیتی۔

ایسے ہنگامہ خیز اور طوفانی دور میں علی رزم آرا کے قتل سے جو سیاسی خلا پیدا ہوگیا تھا اُس کا پر کرنا شاہِ ایران اور اُن کے "مشاورین خاص" کے لئے کوئی آسان کام نہ تھا — اس لئے آسان نہ تھا کہ "اعلیٰ حضرت ہمایونی" اور ان کے درباریانِ درگاہ کو مصدق کی جماعت کا اقتدار یکقلم منظور نہ تھا — نہضتِ ملی اور تودہ گروہ کے اخباروں نے شور مچایا کہ مذبذب اس لئے ہے کہ انگریز مصدق کے دشمن ہیں اور "دربار" انگریزوں کے خلاف قدم اُٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا — جاتا ہے کہ اس مشکل گھڑی میں شاہ کی بہن رشدف پہلوی نے جو بڑے ہوش و گوش کی عورت سمجھی جاتی ہے اور اپنے باپ شاہ ہی کی طرح تند اور ڈکٹیٹر مزاج کی واقع ہوئی ہے، شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ ہمت سے کام لے اور اپنے مشاورِ خاص دربار حسین علاء کو وزیر اعظم کا قلمدان سپرد کردے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۵۱ء میں حسین علاء وزیر اعظم بنا دیا گیا۔

حسین علاء کا شمار ایرانی شرفاء کے صفِ اول میں ہوتا ہے۔ وہ ایران کی نرم و نازک تہذیب کا صحیح نمایندہ ہے، ایک اعتدال پسند سیاست داں کی حیثیت رکھتا ہے۔ برسوں لندن۔ پیرس۔ واشنگٹن میں ایرانی سفیر کے خدمات بھی انجام دے چکا ہے۔ تیل کی صنعت کو قومی بنانے کے جنگجویانہ مطالبہ سے بنیادی اختلاف تھا۔ اس کی نگاہ میں یہ تجویز اگر جذباتی نہیں تو بے ازوقت ضرور تھی۔ بعد از جنگ کے بین الاقوامی حالات کے پیشِ نظر ایران کا انگریزوں سے لڑنا جھگڑنا اس کے نزدیک خطرناک بھی تھا اور ملکی مفاد کے خلاف بھی۔ وہ اس معاملہ میں آہستہ روی کا حمایتی اور بے صبری کا مخالف تھا۔

وزیر اعظم کی حیثیت سے حسین علاء کا انتخاب کتنا ہی مناسب اور موزوں کیوں نہ رہا ہو لیکن ملک کا بدلا اور بپھرا مزاج ایسے افراد کو وزیر اعظم کی مسند پر نہیں دیکھ سکتا تھا — چنانچہ کہا گیا کہ "اگر ہمیں حسین علاء ہی کو قبول کرنا تھا تو علی رزم آرا کا خون کیوں کیا گیا — کیونکہ یہ شخص تو رزم آرا سے بھی زیادہ انگریز پرست ہے"۔

غرض کہ مجلس کے اندر اور باہر ہر جگہ بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی اور اس صورتِ حال پر ابھی تین ماہ بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ حسین علاء کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی خالی کرنا پڑی۔

حسین علاء کے برطرف ہونے کے بعد دُنیا کی کوئی طاقت "محبوب ملت" اور "خادمِ وطن" مصدق کو وزیر اعظم بننے سے نہیں روک سکتی تھی اور نہیں روک سکی — مئی ۱۹۵۱ء کی ۱۰ بجے صبح کو ایرانی مجلس کی تقریباً متفقہ رائے سے اُسے ایران کا "مخلص، وطن دوست اور ہمدرد ملت" وزیر اعظم چنا گیا — اس تاریخی انتخاب کے بعد مصدق نے مجلس کے

آہنی دروازوں کے آگے ایک زبردست جمعیت کے سامنے آہوں اور آنسوؤں سے بھری ہوئی تقریر کی اور اعلان کر کہ بہ حیثیت وزیر اعظم کے اس کا پہلا فرض یہ ہوگا کہ ملک کے اقتصادیات کی ٹوٹتی ہوئی کمر کو سیدھا کرے (۲) ایران سے "ہر طرح" کے خارجی نفوذ و اثر کو یکقلم دور کر کے ملک کو "حقیقی طور" پر آزاد بنائے۔

آخر کار شاہ ایران کو عوام اور مجلس کے رجحان کے سامنے سر جھکانا پڑا اور مصدق کے انتخاب کو "بارگاہ ہمایونی" سے قبولیت کی سند حاصل ہوگئی۔

مدتوں کی جدو جہد اور تاریخی نشیب و فراز کے بعد ایرانی قوم کی یہ پہلی "شاندار فتح" تھی اور تمام خاور میانہ میں انگریزی سیاست کی پہلی شکست — انگریز سمجھ گئے کہ ہوا کا رُخ اُن کے خلاف ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں ان کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کی ابتدا ہو چکی ہے۔

**مصدق اور انگریز** حکومت کی باگ سنبھالتے ہی تیل کی صنعت کو عملاً قومی بنانے کے سلسلہ میں مصدق نے انگریزوں کے خلاف جس غیر معمولی جرأت اور حیرتناک تیزی سے کام لیا وہ ہمیشہ ایرانی تاریخ کا ایک یادگار ورق رہے گا۔

ابھی ڈاکٹر مصدق کو وزیر اعظم بنے پورے دو مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ اُس نے ۱۲ جون ۱۹۵۱ء کو ایران کے مشہور شہر آبادان میں جو تیل کا مرکزی کارخانہ انگریزی کمپنی کے تحت کام کر رہا تھا، اُسے ایرانی حکومت کے کنٹرول میں لے لیا اگرچہ ۱۹۳۳ء کے ایرانی، انگریزی معاہدہ کی رو سے ۱۹۹۵ء تک ایرانی حکومت ایسا کرنے کی مجاز نہ تھی۔ اتنے مشکل کام کا اتنی آسانی کے ساتھ انجام پا جانا یقیناً معجزہ سے کم نہ تھا۔ انگریزوں نے ایران کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کے تمام ہتھکنڈے استعمال کر ڈالے۔ ایرانی، عراق کی سرحد پر فوجیں بٹھائی گئیں۔ شط العرب میں جنگی جہاز بھیجے گئے۔ یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ ممکن ہے برطانوی حکومت اپنے چھتریاز سپاہی ایران میں اُتارنا شروع کر دے۔ غرض طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں مگر مصدق پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا — بجلی کی سرعت کے ساتھ سارے ملک میں "ایران و انگلیس تیل کی کمپنی" کا نام بدل کر "ایرانی قومی تیل کی کمپنی" ہوگیا — اور ونسٹن چرچل نے نہایت غصہ کے ساتھ بیان دیا کہ "ایرانی گورنمنٹ نے ہمارا جایز حق زبردستی غصب کر لیا"۔

ایران و انگلستان کی بڑھتی ہوئی کشمکش کی وجہ سے بین الاقوامی فضا سخت مکدر ہو رہی تھی۔ تیسری جنگ عظیم کا احتمال بڑھتا جا رہا تھا۔ عام طور پر یہ اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ ممکن ہے برطانیہ اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے جنوبی ایران میں، جہاں تیل کا میدان اور تیل صاف کرنے کا دُنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے، اپنی فوجیں اُتار دے — اور اگر ایسا ہو تو ۱۹۲۱ء کے ایرانی۔ روسی معاہدہ کے مطابق روس بھی اپنے سپاہی یقیناً ایران میں بھیجے گا۔ یہ حالت دو نتیجوں سے خالی نہیں ہوگی — یا تو اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے روس و انگلستان میں جنگ ٹھن جائے گی یا پھر ایران دو حصّوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ شمال کا حصّہ روس دبا بیٹھے گا — جنوب کا انگلستان — پھر بھی دونوں میں جنگ کا چھڑ جانا حتمی ہوگا۔ کیونکہ روس، ایران کے شمالی حصّہ کو جس کی جغرافیائی اہمیت مسلّم ہے، اپنے کنٹرول میں لے آنے کے بعد خاموش نہیں بیٹھے گا اور آہستہ آہستہ اپنے نفوذ و اثر کو پھیلانا شروع کرے گا (افغانستان اور پاکستان بغل میں ہیں) اور اگر ایسا نہ بھی کرے گا تو امریکہ کا اس خطرناک صورتِ حال کا خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہنا کسی طرح ممکن نہ ہوگا، لیکن یہ اندیشہ صحیح نہیں تھا۔ جن لوگوں نے مشرق وسطیٰ کی ملیٹری اسٹریٹیجی (Military Strategy) کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ امریکہ ہو یا انگلستان، ہندوستان کی آزادی کے بعد اب کسی مغربی ملک کا (خصوصاً انگریز کی

ت میں کوئی بڑی فوج یا لشکر لانا جغرافیائی اعتبار سے گویا ناممکن سی بات ہوکر رہ گئی ہے۔ ہندوستان غلام ہوتا تو فوج کشی
ن تھی، لیکن اُس وقت ایران انگریزوں کے خلاف اُنگلی اُٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ رہا عراق تو وہاں حسابیہ کے
نہ میں، جہاں انگریزوں کا مشہور ہوائی اڈہ ہے، کچھ انگریزی فوجیں ضرور پڑی ہوئی ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی نہیں کہ کسی
جنگ میں استعمال کی جاسکیں۔ ہاں مصر میں البتہ بڑی خاصی تعداد انگریزی فوج کی موجود ہے جو نہر سویز کی دفاع یا
ع کے بہانہ کی غرض سے وہاں رکھی گئی ہے، لیکن اس فوج کا بھی ایران میں اُتارا جانا بہت دشوار ہے، کیونکہ اول تو
ن ومصر کے درمیان مسافت اتنی طویل اور پیچ در پیچ ہے کہ وہاں سے یہاں فوجیں لانا جوئے شیر کا لانا ہے۔ مسافت کے
دہ مشرقِ وسطیٰ کے وہ ممالک جو مصر و ایران کے درمیان واقع ہیں یقیناً آسانی کے ساتھ برطانوی فوجوں کو اپنی اپنی
حدود سے عبور کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اور اب کسی کا یہ جبر لشکر کشی کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ لاکھوں مشکلات
روں دشواریاں ہیں۔ رہا امریکہ تو اُس کے لئے اس طرح کی فوج کشی اور بھی دشوار ہے۔ اس کے علاوہ دونوں ممالک
مل کر بھی ایران میں روس کے خلاف جنگ کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ روس کا ایران میں فوجیں اُتار
ا چشم زدن کی بات ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں داخل ہوجائے۔ برطانیہ اور امریکہ کو
یسا یہ والی آسانی میسر نہیں ـــــ غرض خطرہ عالمی جنگ کا اُتنا نہ تھا جتنا کہ ایران کی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے
لی انقلاب کا ـــــ ایران و برطانیہ کی باہمی نزاع کے سبب ایرانی تیل دُنیا کے بازار میں بقدر ضرورت بک نہیں سکتا
ا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ایران کے پاس ٹینکر (تیل کے حمل ونقل کا مخصوص آبی جہاز) موجود نہیں ـــ
ن ہی گیا، بجز جاپان کے اور کسی ایشیائی ملک کو ٹینکر میسر نہیں۔ یورپ کے ایسے ممالک جو ٹینکر رکھتے ہیں اور ایران کا
ی بہ آسانی خرید سکتے ہیں وہ "اردپائی اخوت" کی بنا پر برطانیہ کو رنجیدہ کرنا چاہتے نہیں۔ مزید یہ کہ تقریباً ایسے سارے
برطانیۂ عظمیٰ کے مقابلہ میں ایک معمولی ایشیائی ملک، ایران کی حد سے بڑھی ہوئی "گستاخی و جرأت" پر برافروختہ ہورہے
ے۔ خلاصہ یہ کہ بغیر ٹینکر کے تیل کا خارجی بازار میں بھیجا جانا ممکن نہ تھا اور اگر تیل باہر نہ بھیجا جائے تو ملک کی اقتصادی
لت پر اُس کا ہولناک اثر پڑنا اور داخلی انقلاب کی شکل اختیار کرلینا یقینی تھا ـــ یہ صورتِ حال روس کے لئے جتنی
بد افزا تھی، امریکہ کے لئے اتنی ہی تشویشناک۔

اس لئے امریکہ کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہوجائے۔ لیکن کوئی حل پیدا ہو تو کیونکر ہو،
ران و برطانیہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف غصہ و نفرت کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے اور دونوں کے سامنے
ناعوت کا سوال تھا۔

مصدق کو اس بات پر فخر تھا کہ "ہم نے انگریزوں کی انتہائی مخالفت کے باوجود اپنی تیل کی صنعت کو قومی بناکر چھوڑا"
ر انگریز یہ سوچ کر اینٹھے ہوئے تھے کہ "تم نے ایسا کرلیا تو کیا ہوا۔ ہم تمھیں ہر طرح کے اقتصادی شکنجہ میں کس کر تسلیم
کرنے پر مجبور کردیں گے ـــ"

## پریسیڈنٹ ٹرومن کی وساطت

اس خطرناک تعطل کو دور کرنے کی غرض سے پریسیڈنٹ ٹرومن نے اپنا ایک ذاتی نمائندہ مسٹر ہریمین، ایران بھیجا جو ۱۳ر جولائی ۱۹۵۱ء کو یہاں پہونچا۔ ہریمین امریکہ کے ممتاز سیاست دانوں میں سے ہے اور مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی معاملات کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ ہریمین نے اپنی روز و شب کی کوششوں کے بعد مصدق کو اس بات پر راضی کرلیا کہ اگر برطانوی گورنمنٹ تیل کے قضیہ کو دوستانہ طور پر حل کرنے کے لئے کوئی وفد ایران بھیجے گی تو ایرانی حکومت کی طرف سے اس کا استقبال کیا جائے گا۔

ہرمین، مصدق سے یہ وعدہ لیکر لندن گیا اور چند دن کے بعد وہاں سے ۴ر اگست ۱۹۵۱ء کو لارڈ پریوی سیل، مسٹر ریچارڈ اسٹاکس کی قیادت میں ایک برطانوی ڈیلیگیشن کے ساتھ خود بھی ایران واپس آیا۔ ایرانی حکومت نے گرمجوشی کے ساتھ وفد کا خیر مقدم کیا۔ ہرمین کی کوشش یہ تھی کہ وہ اپنی موجودگی اور مشورہ سے اس اہم مذاکرہ کو نازک اور خطرناک سرحدوں سے کامیابی کے ساتھ نکال لے جائے۔

یہ تاریخی گفتگو بظاہر بڑی پُر امید فضا میں شروع ہوئی کیونکہ اسٹاکس نے مصدق کی درخواست پر برطانوی حکومت کی خوش نیتی کا ثبوت دینے کے لئے ایرانی تیل کا قومی بنایا جانا تسلیم کرلیا۔ یہ ایک بڑی ڈپلومیٹک فتح تھی جو مصدق کو برطانیہ پر حاصل ہوئی۔

## اسٹاکس کی تجویزیں۔ گفتگو کی ناکامیابی

اسٹاکس نے برطانوی حکومت کی طرف سے سمجھوتہ کے لئے حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:-

(۱) برطانوی حکومت ایران کا یہ حق تسلیم کرتی ہے کہ ملک کے اندر اُسے تیل کی فروخت میں پوری آزادی حاصل ہوگی داخلی بکری کا ادارہ بلا شرکت غیرے تماماً ایرانی حکومت کے ہاتھ میں ہوگا۔

(۲) دُنیا کے خارجی بازار میں تیل کی نکاسی کے لئے ایک مشترکہ کمپنی بنائی جائے گی۔ اس کمپنی کا ایک حصّہ دار ایران ہوگا، دوسرا انگلستان۔ انگلستان کے علاوہ دیگر ممالک مثلاً امریکہ وغیرہ بھی شریک ہوسکتے ہیں۔

(۳) تیل کی نکاسی سے جو نفع ہوگا اُس کی رقم برابر برابر حصہ داروں میں تقسیم کی جائے گی، لیکن پچاس فیصدی رقم جو ایران کو ملے گی اُس میں سے پچیس فیصدی منہا کرلی جائے گی۔ یہ منہا شدہ رقم سابق انگریزی کمپنی کو بطور معاوضہ کے دیجائے گی جس نے تیل کے صاف کرنے کا کارخانہ بنایا تھا اور جو اب تیل کے قومی بنائے جانے کے بعد ایران کا مال ہوگیا ہے۔

(۴) جہاں تک کمپنی کے انتظامی امور کا تعلق ہے، وہ ایرانی افسروں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ لیکن پالایشگاہ (Refinery) کا سارا فنی (Technical) محکمہ انگریز ماہروں کے ہاتھ میں رہے گا۔[1]

ایرانی نمایندوں نے ان شرائط کے ماننے سے بالکل انکار کردیا۔ اخباری حلقوں میں ان تجویزوں کو "گہرے دام" تعبیر کیا گیا۔ مصدق نے اپنے بیان میں کہا:- "ایران کا پچاس سال کا تجربہ اُسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ پھر انگریزوں کو کسی حیثیت میں بھی تیل کے کاروبار میں ساجھی اور ساتھی بنائے، ایسی صورت میں تیل کو قومی بنانے کا اصلی مفہوم ہی فوت ہوجائے گا۔ ایران اپنی اس خداداد ملکیت کا پورا پورا مالک ہے اور اس کا اہتمام کرنے میں ہر طرح آزاد۔ ہاں اگر انگریز تیل خریدنا چاہتے ہیں یا تیل کے کارخانہ میں ملازمت کرنا چاہتے ہیں تو ایرانی حکومت سے وہ اس بات کی درخواست کرسکتے ہیں۔ رہا سوال معاوضہ کا سو ایران تیل کی شکل میں اُس معاوضہ کو ادا کرنے کے لئے ہمیشہ طیار ہے جو "پالایشگاہ" کے بنانے میں صرف ہوا ہے"۔ بعض ایرانی لیڈروں کا خیال یہ تھا کہ معاوضہ کا مطالبہ قطعاً نامنصفانہ ہے۔ اس لئے کہ جو رقم 'پالایشگاہ' کے بنانے پر صرف ہوئی ہے، سابق کمپنی اُس رقم سے کئی گنا زیادہ منافع اب تک کماچکی ہے۔ تو دہ پارٹی اور دیگر قومی جماعتوں کے اخباروں کا نظریہ بھی یہی تھا۔

---

[1] یہ شرط اس لئے لگائی گئی تھی کہ انگریزوں کے خیال کے مطابق ایرانی انجینیروں میں کوئی بھی "پالایشگاہ" کو چلانے کی قابل اعتماد فنی صلاحیت نہیں رکھتا۔

## شانی - اسٹاکس ملاقات

یہ وقت وہ تھا کہ ڈاکٹر مصدق کے ساتھ ساتھ آیت اللہ کاشانی کی شخصیت بھی عالمی شہرت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ قومی تحریک کے محاذ پر مصدق اور کاشانی باہمی رفاقت و اتحاد ملک کی سب سے بڑی مضبوطی تھی۔ کاشانی سے مشورہ کئے بغیر مصدق کی حکومت تیل کے لہ کے متعلق کوئی اہم قدم اُٹھانا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ گفتگو کے دوران میں برطانوی وفد کاشانی سے بھی ملا۔ اسٹاکس نی کو برطانوی حکومت کی ایران دوستی اور نیک نیتی کا یقین دلانے کی سعی کر رہا تھا تیل کے قضیہ کے سلسلہ میں تجویزوں کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کاشانی سے استدعا کی کہ وہ مسئلہ کی نزاکت اور پیچیدگی کو اچھی طرح سمجھ لیں یوں کا بیان ہے کہ کاشانی نے اس کے جواب میں پہلو بدل کر تند لہجہ میں انگریزوں کی بُرائیاں شروع کر دیں اور ایران ساری تباہی اور تیرہ بختی کا ذمہ دار انگریزی امپیریلزم کو ٹھہرایا۔ اسٹاکس چند لمحہ تو خاموشی کے ساتھ ساری باتیں تا رہا لیکن جب زیادہ ضبط نہ کر سکا تو کاشانی سے مخاطب ہو کر بولا:۔

"معاف فرمائیے۔ میرے خیال میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ان بددعاؤں کے حقدار ایرانی علماء و امراء بھی ۔ ملّا صاحب! گستاخی معاف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کی بڑھتی ہوئی فلاکت و ناداری کا اصلی سبب خود اس کے خود غرض اور جاہ پرست افراد ہیں۔ جب تک اس ملک کی دولت خواص کے ہاتھوں میں رہے گی، عوام کی اقتصادی ت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔ میں دیکھتا ہوں کہ عوام کی حالت سُدھارنے کی مخلصانہ لگن کسی دل میں نہیں۔ ایران کے راء ہوں یا ملّا سب کے سب اپنی اغراض پوری کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ امیروں اور ملّاؤں کی باہمی سازش غریب نہ کا خون چوس رہی ہے۔ جاہل و خوش اعتقاد عوام کو دھوکا دینے اور اُنھیں "آخرت" کے معاملوں میں اُلجھائے نے کی غرض سے بیسیوں مذہبی جال پھیلا رکھے ہیں۔ کوئی مذہبی پیشوا یہ جرأت نہیں رکھتا کہ اپنے "حجرۂ تقدس" سے نکل کر ش رئیسوں اور خود پرست امیروں کو للکارے۔ نہ کوئی سیاسی لیڈر ایسا ہے جو نیم گرسنہ مزدوروں اور کسانوں کی داد ہونچے اور بڑے بڑے زمینداروں کے پنجۂ ظلم سے مصیبت زدہ عوام کو نجات دلائے۔ جس ملک کی حکومت "خاندانی رہ" کی حیثیت رکھتی ہو۔ جس ملک کے وزراء و حکام آپس میں بھائی بھائی اور رشتہ دار ہوں، وہاں کے ننگے اور فاقہ کش نہ کی حالت کیا بدل سکتی ہے۔ ملّا صاحب! آئینہ خانوں میں بیٹھنے والوں کا دوسروں پر ڈھیلے پھینکنا عقل کی بات ں۔ فقط انگریزوں کو بُرا کہنا سود مند نہیں ہو سکتا۔ مرض اتنا خارجی نہیں، جتنا کہ داخلی ہے۔ ضرورت ہے کہ توجہ دی اسباب کی طرف کی جائے۔ ایران کا حکمراں اور دولتمند طبقہ اگر حقیقتاً خلوص کے ساتھ، ملک کی ننگی، بھوکی، ر اور سسکتی ہوئی جنتا کی حالت سنوارنا چاہتا ہے تو شمع کا رخ پہلے اپنی طرف پھیرے اور اپنے افعال کا سچائی کے تھ محاسبہ کرے۔ جس ملک کے سرمایہ دار اور ثروت مند افراد کروروں روپئے غیر ملکی بنکوں میں جمع کریں اور اپنی گی کا بڑا حصّہ لندن، پیرس، واشنگٹن وغیرہ کے عالیشان ہوٹلوں میں گزاریں، اُس ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت لکر بہتر ہو سکتی ہے۔ کیا آپ کی شریعت اور آپ کا مذہب یہ اجازت دیتا ہے کہ اعلیٰ طبقہ کی عورتیں تو پوڈر، کریم، اِشک اور شاندار کپڑوں پر لاکھوں روپے ماہانہ خرچ کریں لیکن غریبوں کی بیویاں، بہو، بیٹیاں یا تو در بدر ٹھوکریں تی پھریں یا پھر افلاس کے فشار سے ہولناک امراض کا شکار ہو کر قبل از وقت دُنیا سے گزر جائیں ——!"

کہنے والوں کا بیان ہے کہ کاشانی نے اپنا اونچا سر نیچا کر لیا اور اسٹاکس کی اس تنقید کے جواب میں ایک حرف بھی اُنکے سے نہ نکل سکا —— لیکن ایک دوسرے سیاسی لیڈر جو اُس موقع پر وہاں موجود تھے، اکسٹاکس سے مخاطب ہو کر لگے:۔ "آپ نے جو کچھ فرمایا وہ بڑی حد تک صحیح ہے اور ہمیں ان بدمزہ حقایق کا اعتراف ہے — لیکن مجھے یہ

کہنے کی اجازت دیجئے ہے " اے بادِ صبا این ہمہ آوردۂ تست !" طبقۂ بالا کے مزاج کا یہ تعیشی اور خود غرضانہ رجحان آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے، ہماری زندگی کی بہت سی بلائیں آپ کی لائی ہوئی ہیں۔ ہمارا ذوق، ہماری تہذیب، ہمارا سیاسی اقتدار، ہماری اقتصادی حالت، غرض ہماری زندگی کا سارا ڈھانچہ آپ کے خود غرضانہ چالوں کا نتیجہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ ہماری حیات قومی کا کوئی ایسا اہم پہلو نہیں جس پر آپ کے ظالمانہ پنجوں کا نشان نہ ہو۔ آپ نے اپنے ملک کی عظمت و خوشحالی کے لئے ہمارا خون طرح طرح سے چوسا ہے۔ ایران ہی کیا، سارا ایشیا آپ کے بیرحمانہ لوٹ کھسوٹ کا فریادی ہے۔ لیکن ہم بیدار ہو چکے ہیں۔ آپ کی بازیگری اب ہم پر اثر نہیں کر سکتی۔ ہمیں اپنے مغرب زدہ ذوق اور تہذیب میں انقلاب پیدا کرنا ہے "

کاشانی نے جوش میں آکر کہا : "اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے تیل کی لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ کامل قومی آزادی کی طرف یہ ہمارا پہلا قدم ہے۔ آپ یقین کریں۔ خارجی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد، ہم داخلی کمزوریوں کی زنجیریں توڑنا شروع کر دینگے"

اکسٹاکس مشن ۲۳ر اگست کو لندن روانہ ہوگیا۔ ہربرٹ ماپوسانہ امریکہ واپس گیا۔ برطانوی حکومت نے جو یہ دیکھا کہ مشن ناکامیاب رہا تو اس نے تیل کی صنعت کو قومی تسلیم کرنے کی منظوری واپس لے لی۔ ایرانی اخباروں نے برطانیہ کے اس ردِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ " انگلستان کا اس طرح قول سے پھر جانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ایسی رذیل قلابازیاں ہمیشہ سے اُس ملک کی قومی خصوصیات رہی ہیں ——"

دونوں ملکوں کے تعلقات تلخ تو ہو ہی رہے تھے، اس گفتگو کے ٹوٹ جانے کے بعد تلخ تر ہو گئے۔ فوجی طاقت تو ایران کے خلاف استعمال کی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لئے اب برطانیہ کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی موثر حربہ نہ تھا کہ اقتصادی فشار میں لاکر ایران کو جھکنے پر مجبور کر دے۔ اُس نے اپنی اس گرفت کو طرح طرح سے سخت تر کرنا شروع کر دیا۔ اول تو برطانیہ، ایران کی وہ رقم دینے میں پس و پیش کرنے لگا، جو تیل کے حق الامتیاز (Royalty) کی صورت میں اُسپر واجب الادا تھی۔ پھر برٹش ٹریژری نے وہ تمام تسہیلات واپس لے لئے جو جنگ کے بعد ایران کو ملتے آرہے تھے اگرچہ وہ اسٹرلنگ علاقہ کا ممبر نہ تھا۔ یہاں تک، کے شکر، اسپات اور لوہا وغیرہ جیسی معمولی معمولی چیزیں بھی ایران کو ملنا بند ہوگئیں —مصدق نے اس کا انتقام یہ لیا کہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۱ء کو آبادان سے جہاں دُنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے کا کارخانہ یعنی 'پالایشگاہ' موجود ہے، انگریز کارکنوں، ماہروں اور کارشناسوں کو ایک ہفتہ کے اندر ایران چھوڑ دینے کا حکم دیدیا۔ یہ دوسری بڑی رسوائی تھی جو ایران میں برطانوی اقتدار کو اُٹھانی پڑی۔ دنیا حیرت میں تھی کہ آخر مصدق کیا کرنا چاہتا ہے۔ صلح و صفائی کی باتیں یوں نہیں ہوا کرتیں۔

## جہانی عدالت میں۔ ایران کی جیت

برطانوی حکومت نے جب یہ دیکھا کہ ڈپلومیٹک گفت و شنید کے ذریعہ سے تیل کے مسئلہ کا کوئی خاطر خواہ حل پیدا نہیں ہوا اور مصدق اپنی جگہ پر اڑا ہوا ہے تو وہ اس قضیہ کو سلامتی (سیکورٹی) کونسل میں لے گئی۔ اُس کا دعویٰ یہ تھا کہ ۱۹۳۳ء کے معاہدہ کی رو سے ایران ۱۹۹۵ء سے پہلے نہ تیل کو بہ جبر قومی بنانے کا حق رکھتا ہے اور نہ وہ انگریزی کمپنی کو تیل کے کارخانہ کی شرکت سے محروم کر سکتا ہے۔ ایران کا نظریہ تھا کہ انگریزوں کی اپیل قانونی اعتبار سے صحیح نہیں۔ یہ قضیہ سلامتی کونسل کے معاملا ذمہ داری سے باہر ہے اور کونسل اس موضوع پر بحث کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ مصدق اپنے مقدمہ کی پیروی کے لئے ۱۵ر اکتوبر کو خود نیویارک گیا اور سیکورٹی کونسل میں اس موضوع پر پُرجوش تقریریں کیں۔ سلامتی کونسل نے معمولی بحث و مباحثہ کے بعد ہندوستانی نمایندہ سر بنیگل نرسنگھ راؤ کے مشورہ سے اس مسئلہ کو جہانی عدالت (World Court) کے سپرد کر دیا

وہ فیصلہ کرے کہ آیا سلامتی کونسل اس اپیل کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتی ہے یا نہیں"۔ مسٹر راؤ کے اس "غیر جانبدارانہ رہ" پر ہندوستانی حکومت کو ایران کی طرف سے مبارکباد پیش کی گئی۔ یہ بھی کہا گیا کہ حقیقتاً راؤ نے ایران کی سچی حمایت کی ایک محترم ایشیائی ملک کے نمائندہ کو ایسا ہی لازم تھا۔ جب یہ مقدمہ ۵۲ء میں جہانی عدالت میں پیش ہوا تو اپنے حق دفاع کے لئے مصدق وہاں بھی گیا۔ بلجین قانون داں، پروفیسر رولانڈ نے ایرانی مقدمہ کی بڑی پُرزور وکالت کی۔ ہیگ کورٹ فیصلہ ایران کے حق میں ہوا۔ خود ایک انگریز جج نے ایران کی حمایت میں رائے دی۔ کورٹ کا فیصلہ یہ تھا کہ لڑائی چونکہ ایک اور تجارتی کمپنی کے درمیان ہے نہ کہ دو ملکوں کے درمیان، اس لئے سیکورٹی کونسل برطانوی اپیل کو قبول کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ اس "تاریخی کامیابی" پر سارے ایران میں شادیانے بجائے گئے۔

## جہانی بینک کی وساطت

ایران اور انگلستان میں صلح کرانے کی ایک اور اہم کوشش ۵۲ء کے شروع میں جہانی بینک کے ذریعہ کی گئی۔ دُنیا کا خیال تھا کہ جہانی بینک جو ایک غیر جانبدارانہ رہ سمجھا جاتا ہے، اس کی وساطت سے دونوں ممالک اپنے قومی اقتدار کو صدمہ پہونچائے بغیر عزت و آبرو کے ساتھ اس ناک قضیہ کو حل کر سکتے ہیں۔ خصوصاً ایران، جس کی اقتصادی مشینری بغیر تیل کی آمدنی کے مشکل سے چل سکتی ہے اور اس نادر موقع سے زیادہ سے زیادہ فایدہ اُٹھانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ ایران کو اقتصادی دشواری میں گرفتار دیکھکر جہانی کو وسیلہ بنانے کی تجویز مقامی اخباروں کے بقول حکومت پاکستان کی طرف سے کی گئی تھی اور اس میں شبہ نہیں یہ تجویز نہایت عاقلانہ اور مناسب تھی۔ چنانچہ قریب ڈیڑھ مہینے تک حکومت ایران اور جہانی بینک مشن کے نمایندوں (گارنڈ پیرو دھام) کے درمیان گفت و شنید ہوتی رہی۔ لیکن آخر میں اس ادارہ کی مساعی بھی نامشکور رہیں۔

بینک مشن کی ناکامیابی کے دو بڑے سبب تھے:-

(۱) ایرانی نمایندوں کا اصرار یہ تھا کہ "پالایشگاہ" (Refinery) کو چلانے کے لئے بینک انگریز ماہروں اور شناسوں کو مقرر نہیں کر سکتا۔ البتہ دُنیا کے اور تمام دوسرے گوشوں سے غیر برطانوی تیل کے متخصصوں اور ماہروں کو لینے میں بینک کو پوری آزادی ہوگی۔

بینک نے اس شرط کو قبول کرنے سے بالکل انکار کر دیا۔ اُس کا جواب یہ تھا کہ بینک ایک بین المللی ادارہ ہے جس کا انگلستان بھی ایک ممبر ہے۔ اس لئے بینک اپنے کاموں کے انجام دینے میں ممبر ممالک کے درمیان کسی طرح کا امتیاز جایز نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے یہ کہ جب تیل کے کارخانہ کو چلانے کے لئے کارشناسوں اور ماہروں کی ضرورت ناگزیر ہے پھر وہی افراد کیوں نہ بلائے جائیں جو برسوں کام کر چکے ہیں۔ یہ بات مصدق کو بالکل پسند نہ تھی۔

(۲) ایرانی حکومت کی تجویز یہ تھی کہ خارجی بازار میں تیل کے بیچنے کا انتظام بہ حیثیت ایرانی ایجنٹ کے بینک خود اپنے ہاتھ لیلے۔ بینک مشن کا جواب پھر یہی تھا کہ بینک ایک جہانی ادارہ ہے اور ایسی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا جس کا جانبداری یا کسی خاص ملک سے ہو۔

بینک کی ایک اور قابل ذکر تجویز جسے مصدق نے قبول نہیں کیا یہ تھی:-

"بینک چونکہ دونوں ملکوں کے مفاد کا ضامن ٹھہرایا گیا ہے، اس لئے اُسے یہ حق حاصل ہوگا کہ دُنیا کے بازار میں تیل کی بکری سے جو مجموعی آمدنی ہوگی اس میں سے پچیس ۲۵ فی صدی رقم کاٹ لیا کرے۔ یہ رقم بطور امانت کے سابق انگریزی کمپنی کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے بینک کے پاس جمع ہوتی رہے گی۔ پالایشگاہ کے قومی بنا لینے کے بعد اس معاوضہ کی ادائی ایران پر واجب ہے ——"

امریکی سفیر مسٹر ہنیڈرسن اور پاکستانی سفیر مسٹر غضنفر علی خاں نے بینک مشن کی کامیابی کی بڑی کوششیں کیں، مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ خود ہنڈرسن کا بیان یہ ہے کہ ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ ڈاکٹر مصدق نے بینک انگریزوں کا طرفدار اور اُن کا 'حلقہ بگوش' کہنا شروع کر دیا تھا — اُس کا خیال یہ تھا کہ بینک "جہانی" نہیں بلکہ 'برطانوی' ہے! اس سلسلہ میں پاکستانی سفیر کی سرگرمیاں بھی معترضانہ نگاہوں سے دیکھی جانے لگیں۔ تودہ (کمیونسٹ) پارٹی اور دوسرے جنگجو اخباروں نے مسٹر غضنفر علی خاں کی مساعی کو "خارجی مداخلت" تعبیر کیا اور اُن پر نا ملائم حملے کئے گئے، اور پاکستان کو انگریزوں کا حمایتی اور اُن کے مفاد کا ہمدرد کہا گیا۔

## مصدق کا غیر صلح جویانہ رویہ

دُنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ مصدق انگریزوں سے بظاہر تیل کی لڑائی لڑ رہا ہے، لیکن اُس کی سیاسی جد و جہد کا مقصد یہ ہے کہ اقتصادی و سیاسی اعتبار سے ایران بالکل آزاد ہو جائے۔ چنانچہ مصدق کی بعض ایسی سرگرمیوں سے جن کا براہ راست تعلق تیل کے مسئلہ سے نہ تھا، روز بروز یہ نمایاں ہو جا رہا تھا کہ اُس کا مقصد ایران کے "تیل" ہی کو قومی بنانا نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایران کے "تخت و تاج" کو بھی "قومی" بنانا چاہتا ہے — یعنی اس کی کوشش یہ ہے کہ ایران کی چھ ہزار سالہ شہنشاہیت کو ختم کر کے اس کی جگہ کی نئی عمارت قائم کر دے[1] — اس مقصد کے حصول کے لئے اُسے کافی پیچیدہ راہ اختیار کرنا پڑی۔ تیل کے مسئلہ میں سرگرمیوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ وہ اپنے حقیقی ہدف کی راہ میں ایران کے طول و عرض

---

[1] یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب ہے کہ اکثر خارجی و ایرانی اشخاص جو مصدقی دورِ حکومت کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے رہے ہیں نظریہ کے موافق نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مصدق کی کوشش یہ تھی کہ وہ رفتہ رفتہ شاہ کے وسیع اختیارات کو محدود کر کے اُسے صرف ایک دستوری بادشاہ رہنے پر مجبور کر دے اور بس — لیکن ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کا خیال یہ ہے کہ مصدق نظام حکومت کی جگہ جمہوری نظام حکومت کا خواہشمند تھا۔ کیونکہ مصدق ہمیشہ سے شاہ اور دربار کو انگریزوں کا طرفدار اور ایران کے قومی مفاد کے خلاف مغربی سیاست کا دمساز سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ شاہی دربار کے بے شمار تشریفاتی محکموں، اداروں شاہی خاندان کے محکموں کے انتظام پر جو کثیر قومی دولت خرچ ہوتی ہے وہ بھی مصدق کو پسند نہ تھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق فقط "دربار" کا سالانہ بجٹ چالیس ملین تومان یعنی چار کرور روپے ہے۔ جس میں شاہپوروں اور شاہ دُختوں (شہزادوں اور شہزادیوں) کے محلوں کے انتظام کا خرچ بھی شامل ہے — اب رہا یہ سوال کہ ایران کو جمہوری بنانے کا خیال اُس کے ذہن میں شروع ہی سے تھا یا بعد میں اپنی بڑھتی ہوئی محبوبیت و اثر کو دیکھ کر اُسے یہ خیال پیدا ہوا، اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ خیال بعد میں پیدا ہوا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کے مشیروں نے اس فکر کا تخم اس کے دماغ میں ڈالا ہو — بہر حال حقیقت جو کچھ بھی ہو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مصدق تیل کی لڑائی سے فایدہ اُٹھا کر شاہ کے اختیارات ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا — لیکن کون سی چیز ہے کہ شاہ کی اہمیت کو عوام کی نگاہ میں اس طرح گرا دینے کے بعد مصدق کا دوسرا قدم کیا ہوتا — ایران کے عوام صدیوں سے اپنے شاہنشاہ کو طاقت، شکوہ، بزرگی اور عظمت کا مرکز سمجھتے آئے ہیں — خصوصاً قریوں، قصبوں اور دیہاتوں کے رہنے والوں کے نزدیک شاہنشاہ ہے، یعنی "شاہوں کا شاہ" اُس کی حیثیت اُن کی نگاہوں میں خدیوِ زماں اور مالک الرقاب کی ہے۔ اگر اولاد نہیں ہوتی تو وجہ یہ ہے کہ شاہ کی نگاہیں پھری ہوئی ہیں۔ اگر قرض ادا نہیں ہوتا تو اُس کا سبب شاہ کی ناراضگی ہے۔ اگر فصل اچھی نہیں ہوئی تو وجہ بھی شاہ کی بیرخی ہی سمجھی جاتی ہے — یہاں تک کہ اگر گائے نے دودھ کم دیا یا مُرغی نے بچے کم نکالے تو کہا جاتا ہے کہ "لطف شاہ" یعنی بادشاہ کی عنایتیں اور مہربانیاں کم ہو گئی ہیں۔ (بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۱۷ پر ملاحظہ فرمائیے)

سے بڑا خطرہ انگریزوں کے وجود کو سمجھ رہا تھا۔

جن لوگوں کو مصدق سے ملنے اور متعدد بار ایرانی معاملات پر اس سے باتیں کرنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُسکے ں میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ اگر انگریز ایران میں باقی رہے تو وہ شاہ اور "دربار" کے خلاف اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتا ہ جب تیل کی صنعت کو زبردستی قومی بنائے جانے کے بعد ایران اور برطانیہ کے درمیان سمجھوتہ کی بات چیت شروع ہوئی ں گفتگو کے دوران میں اُس نے جو سخت اور غیر صلحجویانہ رویہ اختیار کیا وہ ساری دُنیا کے سیاست دانوں کے لئے باعث ت تھا۔ یہ تو دنیا سمجھ رہی تھی کہ مصدق انگریزوں کو ناکوں چنے چبواکر چھوڑے گا اور انگریز بین الاقوامی سیاست کے ے ہوئے حالات کے پیشِ نظر ایران کے خلاف کوئی جارحانہ قدم نہیں اُٹھا سکیں گے ـــــ لیکن یہ بات کہ ڈاکٹر مصدق اپنی عائد کردہ شرائط کے اور کسی دوسری قیمت پر انگریزوں سے صلح کرنے پر راضی نہ ہوگا، شاید دُنیا کے بڑے سے ے سیاست داں اور مدبّر کے علم میں بھی یہ چیز نہ تھی۔

انگریز بُری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تمام مشرقِ وسطیٰ میں ایران سا ی ملک اُن کے خلاف کمر باندھ کر کھڑا ہو جائے گا اور ان کے سیاسی حشم و دبدبہ کو اس حقارت کے ساتھ چیلنج کرے گا بل کی اُلجھتی ہوئی گتھی کو سلجھانے اور مصدق جیسے بلائے بے درماں کے چنگل سے نجات پانے کے لئے یہ اکراہ بڑی بڑی رعایت کرنے کو آمادہ تھے ـــــ مگر مصدق کے تمام شرائط کو بے کم و کاست مان لینا اُن کے بس کی بات نہ تھی نیہ کی مشکلات یہ تھیں کہ اگر وہ ایرانی تیل کے متعلق ڈاکٹر مصدق کی شرط قبول کرلیتا، یعنی یہ کہ انگریز تیل کے خریدار لازم کی حیثیت سے تو قبول کئے جاسکتے ہیں مگر شریک کار کی حیثیت سے نہیں ـــــ تو اس کا اثر عراق اور خلیج فارس منطقوں پر نہایت بُرا پڑتا جو برطانیہ کے کنٹرول میں ہیں۔ ان مقامات پر برطانیہ صرف تیل کا حصہ دار نہیں ہاں کی داخلی سیاست کا مالک و مختار بھی ہے۔ وہاں اُس کی فوجیں ہیں، اُس کے ہوائی اڈے ہیں۔ ایران میں کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا کہ یہ حکومتیں بھی سر اُٹھائیں اور ان علاقوں میں اُس کی سیاست اور تجارت مدتوں خطرہ میں ی ـــــ انگریز یہ کسی طرح برداشت نہ کرسکتے تھے۔ مصدق کے سامنے یہ تمام باتیں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ انگریز آکر نہ جنگ پر اُتر آسکتے ہیں نہ اُس کی تمام شرطوں کو بے چون و چرا قبول کرلینا اُن کے امکان میں ہے۔ غرض ایک تو اُس نے انگریزوں سے زیادہ گھبرائے ہوئے ملک، امریکہ کے ذریعہ شاید دنیا کو دکھلانے کے لئے، معمولی و شنید کا دروازہ کھلا رکھا۔ دوسری طرف سے اُن پر طرح طرح کے فشار ڈالنے شروع کئے۔

## یزی قنصل خانوں کا اخراج

مصدق آبادان سے تیل کے انگریز ماہروں کو، جن کی تعداد دو ہزار سے کچھ اوپر تھی، ایران سے باہر کر ہی چکا تھا، اب اُس نے اپنی توجہ اُن برطانوی ادارو

---

نٹ نوٹ صفحہ ۱۶) ۔ اس لئے ایران کے عوام ایک قانونی شاہ یا بعبارت دیگر ایک "مجبور اور محدود" بادشاہ کا تصور نہیں ۔ لیکن اگر یہی عوام یہ دیکھتے کہ اُن کا شاہ مجبور محض ہے اور ظل اللہ اور یداللہ کے القاب کوئی مفہوم نہیں رکھتے تو پھر کسی ط شخصیت کے لئے ایسے "کھلونہ اور مصنوعی" قسم کے شاہ کو اُٹھا پھینکنا کوئی مشکل بات نہ ہوتی ۔ بہرحال یہ اختلاف کہ مصدق کا رجحان لو جمہوری بنانے کی طرف تھا یا یہ کہ وہ شاہ کے اختیارات کم کرکے اُسے محض ایک قانونی بادشاہ بنائے رکھنا چاہتا تھا، مسئلہ کے بنیادی ئی خاص اثر نہیں ڈالتا۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ کم و بیش ایک ہی نکلتا، یعنی یہ کہ ایران اگر مستبد نہیں تو شخصی حکومت کی فاسد فضا سے کر دستوری یا جمہوری حکومت کی تازہ اور حیات پرور ہوا میں سانس لینا شروع کردیتا اور بلاشبہ مصدق کی ساری سیاسی مساعی کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے۔

اور دفاتر کی طرف مبذول کی جو ایران کے مشہور اور ممتاز صوبوں میں "سیاسی، ثقافتی اور تعلیمی" فرائض انجام دے رہے تھے۔ شیراز۔ اصفہان۔ تبریز۔ مشہد۔ خرشہر جیسے صوبوں میں بڑے بڑے انگریزی قنصل خانے اور مشنری اسکول کام کر رہے تھے۔ برطانوی مفاد کے علاوہ برطانوی ہند کے سیاسی اور تجارتی مفاد کی ذمہ داری بھی انھیں قنصل خانوں کے سپرد تھی۔ ہندوستان و پاکستان کے آزاد ہوجانے کے بعد یہ سلسلہ اُسی طرح قایم تھا۔

سالہا سال سے یہ قنصل خانے بڑے کروفر کے ساتھ ان صوبوں میں جمے ہوئے تھے۔ خود ایرانیوں کے قول کے مطابق ان علاقوں کی حکمرانی دراصل انھیں قنصل خانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ایرانی گورنر محض دکھاوے کے لئے رکھے جاتے۔ قنصل خانوں کے احکامات سے سرتابی کی وہ جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ بیشتر گورنروں کا انتخاب و تقرر انگریزی سفیر ہی کی ایما اور پسند سے ہوا کرتا تھا۔ جس طرح ہندوستانی ریاستوں کا حقیقی حکمراں "ریذیڈنٹ" ہوا کرتا تھا، وہی حال کم و بیش ایران میں تھا، چنانچہ طہران کے ایک روزانہ اخبار گیہان کے بقول ایک شیرازی جوان کو صرف اس "گستاخی" پر بے شمار کوڑے لگائے گئے کہ وہ قنصل خانے کے کسی افسر کی کُتیا کو وہ مار بیٹھا تھا ——!

دفعتاً ۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء کو ایرانی حکومت نے برطانوی سفارت کو یہ نوٹس دیدیا کہ ایران کے طول و عرض میں جہاں جہاں قنصل خانے اور دیگر ثقافتی ادارے کام کر رہے ہیں وہ سب کے سب دس روز کے اندر بند کردئے جائیں۔ ان دفاتر پر ملک کے داخلی امور میں مداخلت کرنے کا الزام لگایا گیا اور کہا گیا کہ یہ قنصل خانے نہیں بلکہ جاسوسی کے جال ہیں ان قنصل خانوں کو بند کرنے کے دو اور سبب بھی بتلائے گئے:۔ ایک یہ کہ سیاسی اور کلچرل ادارے متقابل (Reciprocal) اصول پر قایم ہوا کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ایسے ادارے وہاں قایم کئے جاتے ہیں جہاں کسی ملک کے ہمقوم باشندے تجارت وغیرہ کے سلسلے میں زندگی بسر کیا کرتے ہیں۔ جہاں تک اس معاملہ میں ایران و برطانیہ کا تعلق ہے دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی موجود نہیں —— برطانیہ کے کسی صوبہ میں ایران کا کوئی قنصل خانہ نہیں، ایران کے کسی صوبہ میں، جہاں جہاں انگریزی قنصل خانے کام کر رہے ہیں، ایک انگریز بھی نہیں رہتا۔ ایسی صورت میں ان سیاسی اداروں کے قایم رہنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی —— رہا سوال ہندوستان اور پاکستان کے مفاد کی نگہداری کا تو اب خیر سے یہ دونوں ممالک آزاد ہیں اور اپنے اپنے قنصل خانے جسوقت چاہیں ان صوبوں میں کھول سکتے ہیں —— اس صریح و صاف نوٹس کے باوجود برطانوی سفارت نے ڈاکٹر مصدق کو اس خیال سے ہٹانے کی انتہائی کوششیں کیں، مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ مصدق کا جواب یہ تھا کہ یہ فیصلہ ساری کابینہ کا متفقہ فیصلہ ہے وہ انفرادی طور پر اس فیصلہ کے رد کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اس سلسلہ میں برطانوی سفیر شاہ سے بھی ملا۔ مگر خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ آخر ۲۱ر جنوری ۱۹۵۲ء کو تمام انگریزی قونصل خانے اور دیگر ثقافتی ادارے بند کردئے گئے اور اُن کے عملہ کو ایران چھوڑ دینا پڑا۔

تمام ایران میں اس "بے نظیر قومی کامیابی" پر خوشیاں منائی گئیں۔ طہران کے گلی کوچوں میں چراغاں کئے گئے۔ مسرت کی فراوانی کا یہ حال تھا کہ بس چلانے والے ٹکٹوں کے لئے اصرار نہیں کرتے تھے، پستہ و بادام بیچنے والے۔ گاہکوں کو دو چار دس دانے ہنس ہنسکر زیادہ دے رہے تھے۔ آیت اللہ کاشانی کے حکم سے ۲۲ر جنوری کو سارے ایران میں تعطیل عمومی منائی گئی۔

انگریز دوست ایرانیوں کے علاوہ خارجی سفارت خانوں کے لوگ بھی انگریز افسروں سے آنکھ چرانے لگے تھے۔ پارٹیوں کے لوگ انگریزوں سے کترا کر گزر جاتے کہ مبادا حکومت کے نزدیک اُن کا شمار انگریزوں کے دوستوں میں ہونے لگے —— الغرض برطانوی سفارت خانہ کو اس دم گھونٹنے والی فضا میں سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اور آخرکار برطانوی سفیر سر فرانسس شیپرڈ ۲۸ر جنوری ۱۹۵۲ء کو ایران سے کسی اور جگہ بھیجدیا گیا۔ (باقی)

(نوٹ) اس مقالہ کا باقی حصہ تمام و کمال آیندہ مہینہ شایع ہو —— **ایران دوست** (مقیم طہران)

# غزلیات حالی کا ایک جایزہ

مسدس، مقدمۂ شعر و شاعری اور یادگار غالب کے مصنف حالی کو کون نہیں جانتا۔ حالی اُردو ادب میں ایک ب نیرنگی کے منظہر ہیں۔ انھوں نے مسدس قوم کے لئے لکھا، مقدمہ ادب کے لئے اور غزلیں عاشقوں کے لئے۔

مقدمہ حالی کا لازوال کارنامہ ہے وہ آج بھی اُردو تنقید کا پہلا سانچہ مانا جاتا ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ ا ہے۔ اسی طرح ہر تنقیدی کتاب میں بنیادی طور پر اسی کا فیض نظر آتا ہے۔ کلیم الدین نے اُردو تنقید پر ایک نظر لتے ہوئے حالی کی مجہولیت عیاں کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اگر آپ ان کی اسی کتاب میں سے حالی کی عبارتیں ان کے نظریات خارج کر دیں تو چند بے ربط عبارتوں کے سوا اور کچھ نہ بچے گا۔ آج جو ناقد کچھ کہنا چاہتا ہے وہ حالی م لے کر ابتدا کرتا ہے۔ آج اُردو میں فن تنقید کہیں بڑھ چکا ہے، لیکن حالی کے لکھے ہوئے مقدمہ کو پڑھکر ایسا معلوم ہے اب تک جو کچھ پڑھا یہ سب اس نقش اولیں ہی کا فیض ہے۔ ان کی عبارت کی سنجیدگی، اعتراضات کی متانت۔ یف کی معقولیت اور اندازِ بیان کا سلجھاؤ، یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آج کے بہت سے ناقد محروم ہیں۔

جب مسدس عوام کے ہاتھ میں پہونچا تو اس وقت کے عام ملکی حالات کے سبب سے اس کی دھوم مچ گئی۔ دیوان ں میں کل ۱۱۳ غزلیں ہیں۔ جن میں قدیم و جدید کا بہ آسانی امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ ان میں جدید غزلوں کی اکثریت ہی ان کی ترتیب قدیم رسم کے مطابق ردیف دار ہے۔ حالی نے اس رسم کی ادائی میں بزرگوں کی سنت دیرینہ کو ملحوظ رکھا لکہ کوئی حرف ایسا نہیں جس میں غزل موجود نہ ہو۔ ان غزلیات میں سے ممکن ہے کوئی غزل کسی مشاعرے کے لئے یا کسی کی یش پر کہی گئی ہو۔ لیکن ایسی شاید دو تین غزلیں ہی ہوں گی۔

ان کے علاوہ کافی تعداد ایسی غزلوں کی ہے۔ جن میں مولانا نے بہ خیال خویش زمانے اور عمر کی رعایت پیش نظر رکھی ۔ ان غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں لہجہ کے اعتبار سے سنجیدگی و متانت ہے۔ مضامین میں پند و وعظ کی پختگی ہو ں کہیں کہیں طرز ادا میں شوخی و بے ساختگی بھی ہے۔ ایسے چند اشعار دیکھئے :-

ہے وقت رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں — آخر ہوئی رات اور ابھی شام ہے گویا

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا — یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا — کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں — گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

یا کھینچ لا کے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ — یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے

ان اشعار میں شعریت نہ سہی، لیکن استادانہ پختگی اور ایک قسم کی کرشمہ کاری ضرور ہے۔ اس میں قوم کے لئے ناصحانہ م ہے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی نصیحتیں ہیں اور وہ سارے مصلحانہ خیالات ہیں جو ایک قومی ہمدرد کا سرمایہ ہوتے ۔ حالی میں غزل کہنے کی بہترین صلاحیت تھی۔ جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو غزلیں انھوں نے صحیح رنگ تغزل سے

ہٹ کر کہی ہیں۔ ان میں بھی شعری چستی اور ایک ہلکی سی تاثیر ضرور ہے۔ حالی کے مجموعہ غزلیات کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) وہ حصّہ جو ان کے رنگ تغزل کا مظہر ہے۔ (۲) وہ غزلیں جن میں تغزل کے بجائے قومی تاثرات غالب ہیں مثلاً :-

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کئے بغیر
دام اُٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کئے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کئے بغیر،

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے دہر کی
چھوڑے گا وقت انھیں نہ مسلماں کئے بغیر

حالی کئے گا کاٹنے ہی سے یہ بے سنتوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کئے بغیر

ایسی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اصلاحی پہلو کے بجائے مرثیت کا رنگ نمایاں ہے۔ قوم کو مخاطب کیا ہے لیکن رخارمر کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک داستانِ پارینہ دہرانے والے کی حیثیت سے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی شخص دلوں میں گداز پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، اب ان کا دل نہایت نرم تھا اور اسی نرم دل میں قوم کی تباہ حالی نے سوز و گداز کی دولت بھر دی تھی اس لئے ایسے مواقع پر ان کے ہر لفظ سے وہ درد ٹپکتا تھا جو صداقت کی دلیل ہوتا ہے۔

(۳) تیسرا حصّہ اس کلام پر مشتمل ہے جس میں حالی یکسر ناصح کا روپ بھر کر سامنے آتے ہیں، گو ان غزلوں میں کوئی اثر و کیف نہیں۔ پھر بھی حالی کے دل کی آواز ہے۔ یہ غزلیں عموماً مسلسل ہیں جن میں شروع سے آخر تک پدرانہ نصیحتیں ملتی ہیں۔ مثلاً :-

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بے گانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے
نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

---

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے نہیں
پر گنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم

حالی قوم کا مرثیہ اچھا لکھ سکتے تھے، رجز خوانی یا دل میں گرمی پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس بات کا ثبوت ایک اور طرح بھی ملتا ہے۔ مسدس کے آخر میں انھوں نے ایک حصّہ ایسا بھی شامل کر دیا ہے جس میں قوم کے دل میں رجائیت اور ولولہ پیدا کرنا چاہا ہے۔ لیکن اس حصّہ کو قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔

(۴) چوتھا حصّہ ان غزلیات پر مشتمل ہے جو صرف ردیف وار ترتیب کے سلسلہ میں طیار کی گئیں جو اکثر بے رنگ ہیں۔

اب ان کی غزلیات کا صرف حصۂ اولیں بچتا ہے جس پر تفصیل سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ لیکن ان پر کسی تبصرہ سے پہلے ان کے مجموعی کلام کی چند عام خصوصیات بیان کرنا ضروری ہے۔

(۱) ان کے کلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کہیں کہیں روزمرہ اور محاورات کی بہتات ہے۔ بعض بعض غزلیں از مطلع تا مقطع اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر صرف انھیں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعر کے پیش نظر صرف روزمرہ کا علم بلند کرنا ہے۔ لیکن کلام کا زیادہ حصہ اس سے خالی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض غزلیں انھوں نے خاص طور پر

رنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے کہی ہیں۔ ایسی غزلوں میں معنی آفرینی یا عام دل کشی کے عناصر نہ سہی لیکن زبان کی حد تک وہ دلکش ہیں۔ مثلاً:-

بری اور بھلی سب گزر جائے گی، یہ کشتی یونہیں پار اُتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتہ ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
ادھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں یونہیں عمر ساری گزر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا یہی ایک دن کام کر جائے گی

ان کی غزلوں کے اشعار میں تعقید و سستیِ بندش کے عیوب بھی ملتے ہیں۔ یہ عیب یا تو ان غزلوں میں زیادہ ہیں مستعمل ردیفوں میں کہی گئی ہیں۔ یا ان غزلوں میں جو ان کے دورِ آخر کی اصلاحی شاعری سے متعلق ہیں۔ اسی ضمن یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی جدید غزلیات میں غیر متناسب الفاظ کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ نصیحت فروشی اس حد تک مستغرق ہوئے کہ شعر کی وہ خوبیاں جن کو انھوں نے مقدمہ میں بالتفصیل لکھا تھا خود فراموش کر بیٹھے مثلاً:-

شب کو زاہد سے نہ مٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

جلوۂ صوفی نہ دکھلایا کوئی، رات بھر یاروں کو چکرایا عبث

جگمگٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

راز دل کی سر بازار خبر کرتے ہیں آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی

صبر و سکوں سے یہ بھی ہم کو نہ بیٹھنے دے تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہش نہانی

ان کے متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں دونوں مصرعے برابر کے نہیں اور کہیں تناسب بیان مفقود ہو گیا۔

حالی کی غزلیں خواہ وہ قدیم ہوں خواہ جدید عامیانہ اور مبتذل اشعار سے پاک ہیں۔ حالی، غالب کے شاگرد تھے اور شیفتہ کے ہیں۔ نیز وہ واقعتاً تغزل کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ درد و سوز جو غزل کی جان ہے۔ ان کے دل میں اس دولت کی فراوانی تھی۔ اسی لئے وہ جب تک دل کی باتیں کہتے رہے حقیقی غزل گو رہے اور جب ناصح مشفق بنے تو نصیحت آمیز باتیں کہنے لگے اور ان میں ابتذال کی گنجایش کہاں۔ ان کی فطری متانت و سنجیدگی بھی ایسے مضامین کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

غزل کا حقیقی محور حسن و عشق ہے۔ جس میں زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات کے دوسرے موضوعات بھی شامل ہوتے گئے۔ حالی نے اس دور میں شعر کہنا شروع کیا جب غالب و مومن غزل کے اندر دو مختلف راستے متعین کر چکے تھے۔ یہ راستے اس سے پہلے بھی تھے لیکن ان کو اس قطعیت کے ساتھ کسی نے مسلسل نہیں پیش کیا تھا۔ اس دور میں شیفتہ اپنے سنجیدہ و نیم متصوفانہ رنگ کے ساتھ اُردو غزل کے لہجے کو سنجیدگی و متانت بخش رہے تھے اور ذوق اور ان کے استاد شاہ نصیر داد زباں دانی دے رہے تھے یا اس وقت شاہ جہاں آباد کی فضائیں غزل کے مختلف اسالیب سے معمور تھیں۔ ایسے میں حالی بھی سامنے آئے۔ وہ روایتاً غالب کے شاگرد ہوئے۔ لیکن ان کو قربت زیادہ تر شیفتہ سے رہی۔ مومن سے انکو اتنی ہی عقیدت تھی جتنی ایک استاد سے دوسروں کو ہو سکتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان پر شیفتہ و مومن کے اثرات پڑے اور غالب سے شاگردوں کے باوجود کچھ دور سے رہے۔ یہ بات بھی باعثِ استعجاب ہے۔ لیکن یہی بات درحقیقت ان کے مذاقِ سلیم کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حالی کے دل میں جو

فطری گداز تھا اس کی نسبت سے شیفتہ و مومن ہی ان کو متاثر کر سکتے تھے۔

ہر چند مومن کی شاعری دل کی آواز نہیں۔ ان کی شاعری میں داخلی عناصر کم اور بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن عشق و تعشق کے وہ مرتعش احساسات ضرور ملتے ہیں جو عشق مجازی کا حاصل ہوتے ہیں۔ حالی صوفیوں سے زیادہ تقدس رکھتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ انھیں تصوف سے کوئی عملی یا ذہنی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ تو محبت کے ان جذبات کی ترجمانی کرتے تھے، جو واقعی محبت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اگر محبت اس عالم آب و گل کے کسی فرد سے متعلق ہو تو اس میں ایک منزل وہ ضرور آتی ہے، جو مومن کی شاعری کا محور ہے۔ اسی لئے ان پر مومن کا اثر نمایاں ہے۔

حالی کی غزلیات قدیم و جدید دونوں کا اگر تفصیلی جایزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اس مجموعہ میں حمد و نعت کی ۳ غزلوں (یا نظموں) کو چھوڑ کر اور کوئی ایسی غزل نہیں جس میں اس طرف کوئی اشارہ ہو۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے رسم زمانہ کے مطابق رسمی طور پر بھی ہمہ اوست یا غیب و شہود کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں جب واقعی "غزل" کہتے تھے تو ان کو اس آفاقی صداقت سے دست کش ہونے کی فرصت نہیں ملی۔ وہ اس زمانہ میں ان جذبات سے سرشار تھے جو غزل کے خلاق ہیں۔ پھر جب وہ اس منزل سے نکلے تو اصلاح قوم کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ یہ وہ منزل تھی جہاں پہونچ کر آدمی کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ اس لئے ان کو صوفی بننے یا ایسے شعر کہنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ انھوں نے ایک قطعے میں اپنے رنگ شاعری کی نسبت خود تفصیل پیش کی ہے۔

ہوئی ریحانِ جوانی کی بہار آخر حیف — طبع رنگیں تھی مئے عشق سے جب متوالی
اپنی رودار تھی جو عشق کا کرتے تھے بیان — جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر خالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ — سر ہے سودا تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر — نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزل کو بنیادی طور پر دل کی باتیں بیان کرنے کا وسیلہ سمجھتے تھے اور جب تک وہ جوان رہے حکایت دل ہی بیان کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کو ماوراء سرحد ادراک کی ان در پردہ حقیقتوں سے کیا کام ہو سکتا ہے جن کو صرف سوچا جا سکتا ہے ——— دیکھا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے اس خیال کو ایک شعر میں نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ ان کا شعر ہے:-

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوق دید بھی — جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

یہ ذوق دید کا پکا اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیات ہی جان غزل ہیں۔ حالی انھیں سانس لیتی ہوئی حقیقتوں کو پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر غالب و شیفتہ کے اس کلام کا کوئی اثر نہیں پڑ سکا جو ہلکی سی متصوفانہ کیفیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں وہ فلسفیانہ دقایق اور بلند تصورات بھی نہیں جو دوسرے بلند مرتبت شعرا کی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ جس طرح ان کے یہاں تصوف نہیں۔ اسی طرح ان کے کلام میں فلسفہ کے وہ عام موضوعات بھی شامل نہ ہو سکے جو فارسی اردو شاعری کے بڑے حصہ پر محیط ہیں۔ اور جنھوں نے واقعتاً غزل کے لہجے کو شائستگی و بلندی عطا کی ہے۔

غرضکہ کلام حالی کا (میری مراد ان کی صحیح غزلوں سے ہے) جایزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ موضوعات شعری کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل عناصر ان کے یہاں موجود نہیں۔

فلسفہ، تصوف، معاملہ بندی، خمریات، محبوب کا نیم زنانہ نیم مردانہ تصور، اور عام اخلاقی باتیں، مثلاً خودداری، بلند ہمتی وغیرہ۔

مذکورۂ بالا اجزا وہ ہیں جن پر فارسی و اُردو غزل کی بنیاد قایم ہے۔ ایک پڑھنے والے کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال ہوگا کہ ان بلند موضوعات شریفہ کے بغیر ان کے یہاں کیا ملے گا۔ لیکن نہیں ان سب کے بجائے نفس محبت و کیفیات ت کی وہ ساری باتیں ان کے یہاں موجود ہیں جن کی مدد سے ایک داستان مرتب کی جاسکے۔

حالی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں طرز ادا میں کوئی پیچیدگی نہیں ملتی وہ نہایت سادگی و صفائی سے کہتے ہیں وہ غزل کی زبان کا ہر قدم پر خیال رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں ایک بے ساختگی و گداز پیدا ہوگیا ہے اشعار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں نفس مفہوم فطری ہے، وہاں انداز بیان میں بھی سادگی کے باعث شعریت موجود ہے ناممکن ہے کہ پڑھنے والا ان سے متاثر نہ ہو۔ طرز ادا کی سادگی، مفہوم کی واقعیت اور انداز بیان میں ایک والہانہ ت اس طرح ملتی ہے کہ دل بے حد متاثر ہوتا ہے۔ آیندہ مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

حالی کے یہاں بہت سے اشعار میں وہ کیفیت ملتی ہے جسے ہم نفسیاتِ محبت کہہ سکتے ہیں۔ وہ بات اسی انداز کہتے ہیں کہ اس میں صداقت و واقعیت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا پہلو بھی ہوتا ہے جو نفسیاتی اعتبار سے ہماری کو اس طرف منعطف کر دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس دیار کے اور اس کے مراحل کے نشیب و فراز اور ے راہ سے پورا پورا واقف ہے۔ اور کچھ ایسی باتیں بیان کر رہا ہے جن کی سچائی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ حالی کے اشعار خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ان اشعار میں انھوں نے محبت و کاروبار محبت کے مختلف پہلو پیش کئے ہیں اور پہلو اس معصومانہ صداقت اور سلجھی ہوئی واقعیت کے ساتھ کہ پڑھتے ہی اک کیف طاری ہوجاتا ہے۔

راہِ محبت میں قدم رکھ کر جو شخص مشکلات سے گھبرا جائے وہ کبھی محبت کا کیف نہیں حاصل کرسکتا۔ محبت اک مستقل ہے۔ لیکن اس وقت جبکہ دل میں اتنا گداز پیدا ہوجائے کہ زخم جگر زخم جگر نہ رہے۔ دل کا جزو بن جائے۔ مفہوم کو کس سادگی سے ادا کیا ہے :-

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق، رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

استیلائے عشق عاشق کو کسی دوسری جانب متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ ایک عاشق کی نظر میں کائنات کے حسین ترین ہر ہیچ ہوتے ہیں، یہ دنیائے شاعری کا عام خیال ہے۔ فارسی و اُردو میں اس پر خوب خوب زور طبع صرف کیا گیا ہے حالی نے اپنی سادہ بیانی سے ایک بالکل نیا پہلو پیش کیا ہے :-

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

قابلِ غور بات یہ ہے کہ شاعر نے محبوب کو سب سے بہتر کہہ کر ظاہری مبالغہ کا اظہار نہیں کیا، وہ کہتا ہے کہ ممکن ہے رے حسین تم جیسے ہوں، لیکن تم تو نہیں ہوسکتے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلے مصرعہ کا یہ ٹکڑا "وہ ہے بات ہی کچھ اور" برمحل ہے کہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ حالی کے اس شعر اور دوسروں کے ایسے اشعار میں یہی فرق ہے کہ حالی نے محبوب کو سب سے بہتر نہیں کہا۔ وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ جو بات تم میں ہے وہ دوسرے میں نہیں مل سکتی کتنی صداقت ور کتنی معصومیت۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے :-

ہوتی نہیں قبول دُعا ترک عشق کی جی چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

دوسرے مصرعہ کی سادہ پرکار کیفیت قابلِ داد ہے، کبھی کبھی محب صادق بھی گھبرا کر ترک عشق کی دعا مانگنے لگتا ہے چونکہ یہ دل کی سچی آواز نہیں اس لئے دُعا قبول نہیں ہوتی۔ دیکھئے شعر میں کوئی معنی آفرینی نہیں۔ انداز بیان میں سل بل" نہیں، بس ایک سادہ سا پہلو ایسا ہے جو تاثیر کی جان ہے:-

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

دوسرے مصرعہ میں صرف ایک لفظ بھی نے شعر میں ایک کیفیت پیدا کر دی۔ کھل کر وفا پرستی کا ذکر نہیں کیا گیا لیکن "جی چرانے" کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ انتہائے وفا پرستی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔

جب تک انسان کو مسرتوں سے کسی حد تک بھی تعلق رہتا ہے، اس وقت تک مصیبتیں زیادہ متاثر کرتی ہیں اس بات کو کنایہ کے طور پر کس خوبی سے ادا کیا ہے:۔

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

اسی غزل کا مقطع ہے۔ جس کی بے ساختگی قابل داد ہے:۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں،

عالم ہجر قیامت آخریں ہوتا ہے، لیکن یہی اضطراب بے پایاں کچھ دنوں کے بعد کم ہوتے ہوتے یاد ماضی تک محدود ہو جاتا ہے۔ دل اس وقت بھی پر خون ہوتا ہے۔ لیکن آنکھیں خون آلود نہیں ہوتیں۔ اس کیفیت کو کس واقعیت کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

ٹھہرتے ٹھہرتے دل یونہی ٹھہر جائے گا بات جو آج ہے وہ کل غم ہجراں میں نہیں

دوسرے مصرعہ کی سادہ نگاری قابل تحسین ہے۔ کتنی سچی بات ہے۔ جو بات آج ہے وہ کل نہیں رہے گی۔ اس سے زیادہ سادہ و پر اثر انداز کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اسی بات کو اسی غزل کے ایک شعر میں اس سے بھی زیادہ اچھوتے انداز کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بات کو اسی غزل کے ایک شعر میں اس سے بھی زیادہ اچھوتے انداز سے پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:۔

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

ان اشعار میں حالی کی دونوں خصوصیتیں ہیں۔ جو حقیقی تغزل کا سرمایہ ہیں۔ اور جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اسی قبیل کے چند اور اشعار دیکھئے:۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی، پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

رات ان کو بات بات پہ سو سو دئے جواب مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید خود بہ خود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں،

کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں سرسری دل کی واردات نہیں

دل رہا پائے بند الفت دام تھی عبث آرزو رہائی کی،

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اب تک جو اشعار نقل کئے گئے ان میں سے بیشتر میں شیفتہ کی جھلک صاف صاف نمایاں ہے۔

(۳) کہا جاتا ہے کہ مومن اپنے رنگ خاص کے خاتم تھے۔ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن حالی کے کلام کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں ایک خاصہ حصہ ایسے اشعار کا ملتا ہے۔ جس پر براہ راست مومن کا پرتو نظر آتا ہے۔ مومن کی تین

یتیں مشہور ہیں - ابہام، لہجہ میں ایک خاص قسم کا بانکپن، اور ان کا یہ تصور عشق محبوب باوجود بازاری ہونے کے انکا بیان
نہیں - ان میں سے اول الذکر خصوصیت حالی کے یہاں موجود ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ اگر کسی کو یہ نہ معلوم ہو
ب کے شاگرد تھے، تو وہ ان کو مومن کا تلمیذ رشید سمجھے گا - ذیل میں ان کے کچھ ایسے اشعار پیش کرتا ہوں - جن پر
کیفیت چھائی ہوئی ہے - جیسے کوئی سعادت مند شاگرد اپنے اُستاد کے رنگ کو فیض باطنی سمجھ کر اپنے اندر جذب کر رہا ہے

سچ ہے کہ پاس خاطر نازک عذاب ہے — تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں — طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب

درد فراق و رشک عدو تک گراں نہیں — تنگ آگئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر — بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر — تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے — تسکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہولیں — دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

تھا یہاں دل میں طعن وصل عدو — عذر ان کی زباں پہ آنے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی — غیر اُلفت بہت جتانے لگے

عدو سے بات محفل میں نہ کرنی — جو سچ پوچھو تو جائے سوئے ظن ہے

کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے — ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت — ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
دھوم تھی اپنی پارسائی کی — کی بھی اور کس سے آشنائی کی

مانع گل گشت ہے بیم خزاں — موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدر نعمت ہے بہ قدر انتظار — حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

غالب کو طرز بیدل میں ریختہ کہنا قیامت معلوم ہوا تھا - لیکن حقیقتاً مومن کا رنگ ایک پل صراط ہے - جس پر چلتے
ہر قدم پر ابتذال کے جہنم میں گرنے کا ڈر رہتا ہے - مومن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اس
بے اختیار سے محفوظ رکھا ہے - حالی نے مومن کے یہاں سے صرف ان کے انداز بیان کا اثر لیا ہے - ان کے یہاں جو
ہے اس سے حالی کا کلام پاک ہے اور یہ ان کی سنجیدہ مزاجی کا براہ راست اثر ہے - ورنہ مومن کے اتنے قریب ہوتے
بھی ان کی بے پناہ شوخ نگاری سے بچنا بڑا مشکل کام ہے -

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے - حالی کے یہاں جام و مینا کی داستان بالکل نہیں اور غالب کی شاگردی کے باوصف
شاعری اس فیض سے محروم رہی - لیکن اس کے بجائے انھوں نے صوفی و زاہد کو اپنے طنزیہ تیروں کا ہدف بنایا ہے اور
ان کی غزلیات کے ایک بڑے حصہ پر چھایا ہوا ہے - یہ رنگ قدیم غزلیات میں بھی ہے اور جدید میں بھی فرق صرف
ہے کہ قدیم غزلیات میں ایسے بیشتر طنز شعریت آمیز ہیں - بلکہ بعض اشعار میں تو یہ طنز بہت چمک اُٹھا ہے لیکن جدید

حصہ میں ان کا یہ پہلو بھی اصلاحی رنگ میں رنگا ہوا ہے - جس کے باعث ان میں صرف استہزا رہ گیا ہے حالی کی قدیم و
غزلیات کے تقریباً بیس فیصدی اشعار زاہد و صوفی کے ذکر سے متعلق ہیں -

حالی کے یہاں ایسے اشعار دو قسم کے ہیں - (۱) وہ اشعار جن میں زہاد پر پھبتی کہی گئی ہے لیکن ایسے اشعا
کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے طنز کا اصل مقصد حاصل ہو سکے - ایسے چند شعر مثالاً نقل کرتا ہوں :-

واعظ کی حجتوں سے قایل تو ہو گئے ہم — کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم — ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

دیکھئے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے — صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

اس رنگ کے اشعار نسبتاً بہت زیادہ ہیں -

دوسری قسم میں وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے ان بزرگوں پر کسی خاص پہلو سے حملہ کیا ہے - اور کوئی ایسی
دکھتی رگ پکڑی ہے یا کوئی ایسی بات پیدا کی ہے کہ شعر پڑھ کر ایک لطف آجاتا ہے - نیز اس کے ساتھ ساتھ زاہد و
صوفی کی حقیقی کمزوری بھی سامنے آجاتی ہے - ایسے چند شعر دیکھئے :-

ان لیجے شیخ جو دعوے کرے — اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

دوسرے مصرعہ کی تعریف نہیں کی جا سکتی - پھر لفظ "بزرگ" نے جو تیزی پیدا کی ہے وہ اس طنز کی جان ہے -

جھگڑوں میں اہلِ دین کے حالی پڑیں نہ آپ — قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

گو مے ہے نند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا — اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر

شیخ اللہ رے تیری عیاری — کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید — جنتی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

اس طبقہ کی کم عقلی کا جس لطیف انداز میں خاکہ اڑایا ہے - وہ دیکھنے کی چیز ہے - خصوصاً "جنتی" کا لفظ طنز کا بھرپور
کہیں افطار کا حیلہ تو نہیں یہ حالی، — آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں،

شعر کی بلاغت ادا دیکھنے کے قابل ہے - زاہد کو مخاطب کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اس طرح مخاطب کرنا گویا اپنی
سرگزشت بیان کی جا رہی ہے، اسی انداز بیان میں جو سچائی ہوتی ہے وہ دوسری طرح ممکن نہیں -

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں — دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہم بھی آداب شریعت سے تھے آگاہ مگر — نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں — رہ گئی شرم پارسائی کی

گو زن و گور ہیں بچپن سے تارک دنیا — نہایت آپ کی ہے ان کی ابتدا اے شیخ

مندرجۂ ذیل شعر دیکھئے - زاہد اگر کسی مرد آزاد کو نماز نہ پڑھنے پر سخت سست کہدے تو سمجھتا ہے کہ آج جہاد اکبر
کا ثواب حاصل ہو گیا - حالانکہ اس تیم العقل کو یہ نہیں معلوم کہ نفسیاتی طور پر اس طرح برسرِ عام سخت و سست کہنے کا
یہ اثر ہوتا ہے کہ پھر وہ شخص اس طاعت گاہ سے بھی بری ہو جاتا ہے - اس بات کو کس سادگی سے بیان کیا ہے :-

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم — تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

(۵) ان کے کلام میں بہت سی غزلیں مسلسل ہیں - لیکن ان میں ایسی ایک غزل بھی نہیں جس میں مومن یا شاد کی طرح

داستان کو بیان کیا ہو۔ ان میں سے زیادہ تر غزلیں اصلاحی ہیں۔ صرف تین غزلیں ان کے مصلحانہ مضامین سے ہیں۔ ایک تو ان کی وہ مشہور غزل جس کا مطلع ہے :۔

جیتے جی موت کے تم منھ میں نہ جانا ہرگز　　دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

یہ غزل دلّی کی بربادی کا دردناک مرثیہ ہے۔ چونکہ بات دل کی گہرائیوں سے نکلی ہے۔ اس لئے اس میں بے حد گداز ہے۔ دوسری دو غزلوں کے یہ مطلعے ہیں :۔

دل کو درد آشنا کیا تو نے　　درد دل کو دوا کیا تو نے

اے بہارِ زندگانی الوداع　　اے شباب لے شادمانی الوداع

پہلی غزل درحقیقت حمد میں ہے اور اصولاً اس کو شروع دیوان میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن غالباً ردیف کی مجبوری آخر میں رکھی گئی۔

دوسری غزل جوانی کا مرثیہ ہے۔ وہی جوانی جس کے لئے ایک جگہ حالی نے کہا ہے :۔

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت،　　پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

اس میں شک نہیں کہ یہ غزل خوب ہے۔

حالی کے یہاں تشبیہات و تعبیرات کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ سیدھے سادے آدمی تھے۔ اسی طرح باتیں کہتے تھے۔ لیکن جہاں جہاں انھوں نے اس صفت کو برتا ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پیدا ہوگیا ہے دیوان میں گنتی کے شعر ایسے ملتے ہیں جن میں یہ خوبی ہو۔ لیکن جن چند اشعار میں کوئی تعبیری کیفیت ہے وہ بجائے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر حسن تعبیر کا بڑا ملکہ تھا۔ مگر اس کو انھوں نے برتا نہیں۔ اس سلسلہ درجۂ ذیل شعر پیش کئے جا سکتے ہیں :۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام　　گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا　　اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے　　مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ　　ایسے الجھا ترے کاکل پیچاں میں نہیں

ہم نے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک　　ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی

مانع گل گشت ہے بیم خزاں،　　موت کرتی ہے نگہبانی مری

رشید حسن خاں

---


## مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے :۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ سورہ یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور دہانِ ماہی۔ حسنِ یوسف کی ۔۔۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوضِ کوثر۔ ام مہدی ۔۔۔ اور پل صراط۔ آتشِ نمرود وغیرہ وغیرہ۔ کاغذ سفید و دبیز۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

# روس کا سیاسی فکر و شعور

سر برنارڈ پیر ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ:-

"روسی قوم کی خصوصیت خاصہ اس کی سوچنے کی عادت ہے، سوچتے رہنا اس کا دلچسپ مشغلہ ہے، روسی کسان اسی لئے نہایت دلچسپ ہستی ہے کہ زندگی کے واقعات جس طرح اس کے سامنے آتے جاتے ہیں، اس کا غور و تفکر اپنے لئے نئی راہیں نکالتا جاتا اور پھر اس کے اظہار و بیان کا طریقہ بھی ڈھونڈھ لیتا ہے، وہ اپنے تئیں اپنے خیالات کے اظہار پر مجبور بھی سمجھتا ہے! روسیوں کا یہ غور و فکر کہیں محدود نہیں ہے اور انکا سوچنا اور بیان کردینا نہایت سچا اور مخلصانہ ہوتا ہے!"

سوویٹ مصنف الیکزی ٹالسٹائی نے کہا ہے کہ "روسی کھائے بغیر بہت دیر تک رہ سکتا ہے مگر کہے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔"

چنانچہ آج ہم جس ملک کو سوویٹ یونین کے نام سے جانتے ہیں، اور جو کم و بیش ڈیڑھ کرور مربع میل میں پھیلا ہوا، چھوٹے بڑے بارہ سمندروں کے کنارے چھوتا ہے، یہ ملک روسی عوام ہی کے سوچ بچار کا بنایا ہوا ہے۔

روسی تاریخ بتاتی ہے کہ روس ہر زمانے میں بیرونی حملوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ مگر ان حملوں کی مدافعت اور اپنا بچاؤ کرنے کے لئے روسی قوم کسی دوسری قوم کی شرمندۂ احسان نہیں ہوئی۔ خود روس ہی کے فرزندوں نے خون بہاکر اپنے وطن کو غیر کی غلامی سے آزاد کرایا۔

روسیوں کو اس بات کا پرغرور احساس ہے کہ انھوں نے اپنے وطن کی مدافعت کرکے انسانیت کی بھی خدمت کی ہے۔ تاتاری یلغار کو روک کر اس نے یورپی اقوام کو محفوظ رکھا اور یورپی حملوں کو روک کر مشرقی اقوام کو بچایا۔

قدیم روس میں داستان گوئی بہت عام تھی، اور یہ داستانیں سینہ بسینہ منتقل ہوتی رہتی تھیں لیکن سترھویں صدی سے پہلے ضبط تحریر میں نہ آسکی تھیں۔ یہ داستان گو بوڑھے مرد اور عورتیں ہوتے تھے جن میں نابینا بھی ہوا کرتے تھے ان داستانوں کا مسالہ تلہ آوروں کے معرکوں سے لیا جاتا تھا، رجحان ان داستانوں کا ہمیشہ مذہبی رہا۔

بارھویں صدی میں POLOTSE کے وحشیوں نے روسی علاقے کو روند ڈالا تھا ـــــ چنانچہ اسی عہد میں جب تاریخی داستان لکھی گئی تو اس کے مولف نے مسالا پولوتسی کی جنگ کے واقعات ہی سے لیا۔ اس داستان کو روسی قوم کی رزمیہ (ایپک) کا درجہ حاصل ہے۔

تیرھویں صدی میں بٹوٹن حملہ ہوا اور دشمن بالٹک علاقے کو روندتا ہوا روس میں گھس آیا۔ اس وقت روسی فوج نے اس مدافعانہ جنگ میں شجاعت اور وطن پرستی کی جو مثال قایم کی اور جس تیزی کے ساتھ دشمن کی قوت کو پاش پاش کیا، اس نے بٹفسکی کو نہ صرف سارے روس میں ہر دلعزیز بنادیا بلکہ اس کی جنگی قابلیت کا شہرہ روما تک پہونچگیا۔

اس کے بعد منگول حملوں کا دور شروع ہوتا ہے جس کے باعث روس کا ارتقاء کم و بیش دو سو سال تک رکا رہا۔

سی قوم غلام بنالی گئی، اس کی بستیاں ویران کردی گئیں اور اس کا کلچر مٹا دیا گیا۔ لیکن اس تباہ حالی میں بھی مقامی
نغمہ نگاری مفقود نہیں ہوئی۔ نئے نئے عوامی گیت بنتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت جو گانے بنے، ان میں منگول مظالم
تباہ کاریوں کا ہی بیان ہو سکتا تھا۔ منگولوں کا غلبہ اگرچہ تقریباً دو سو سال تک رہا لیکن روسی قوم نے اس کو دو دن
لئے قبول نہیں کیا۔

روسی قوم کی اس جدوجہد کو پشکن نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"روس ایک اعلیٰ مقصد کے لئے مقدر ہوا ہے۔ روس کے وسیع میدانوں میں منگولوں کے جم غفیر یورپ پہونچنے سے پہلے فنا کردئے گئے۔ منگول فوجیں مفتوح روس کو پیچھے چھوڑ کر یوروپ میں بڑھ جانے سے ڈرتی تھیں.....
یورپ کی ترقی پذیر علمی روشنی کا تحفظ زخمی و ناتواں روس نے کیا۔"

چودھویں صدی میں ایک زبردست حملہ کر کے منگولوں نے روسی مزاحمت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہا تو روسی
رانوں کو ہوش آیا اور مدافعت وطن کے لئے متحد ہو گئے۔ اس متحدہ طاقت نے ماسی (MAMI) منگول جرنیل کو فاش شکست
ی اور روس ہمیشہ کے لئے غیر کی غلامی سے محفوظ ہو گیا۔

روسی تاریخ کی اس عظیم الشان جنگ اور فتح کی یاد میں کئی کتابیں لکھی گئیں جن میں "زوونش چینا" اور "واقعات
لسکوئی" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ وہ تاریخی تقاضے تھے جن کی بناء پر سولھویں صدی میں پورا روسی علاقہ ایک قومی اتحاد کے اندر منظم ہو سکا۔ اس
ادے روسی کلچر نے جو ترقی کی اس کی اہمیت کا اندازہ دشوار ہے۔ مختلف بولیاں گھل مل کر ایک روسی زبان وجود میں
، نقاشی اور فن تعمیر کی ایک مشترک طرز وضع ایجاد ہوئی اور صناعتی ترقی کا راستہ صاف ہوا۔ سولھویں صدی کے
ط میں پہلا چھاپہ خانہ قایم ہوا۔

روس کا یہ نیا قومی اتحاد جس کا مرکز ماسکو تھا، اتنا طاقتور ثابت ہوا کہ کبھی کوئی حملہ ہوا بھی تو بری طرح پسپا
دیا گیا اور پڑوسی چھوٹی طاقتیں اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں ماسکو کی امداد پر بھروسا کرنے لگیں شمالی قفقاز اور
س وغیرہ نے سرپرستی کی درخواست کی اور سترھویں صدی میں آذربیجان نے بھی ایسی ہی درخواست پیش کی۔

اس اتحاد کا حقیقی سبب وطنیت کا جذبہ تھا۔ چنانچہ سترھویں صدی میں پولینڈ نے روس پر حملہ کیا تو سارا روس
د ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور پولینڈ کو شکست فاش دی۔

روسی اہل فکر سچے عیسائی تھے اور آسمانی بادشاہت کے منتظر اور اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ جمہوریت کا تخیل تھا۔
روسی انداز فکر کی دو صورتیں تھیں۔ ایک مغربی یورپ کا تتبع، دوسرے سلافی نسل کی روایات کو مذہبی بنیادوں پر
ر نو قایم کرنا اور مادہ پرستی سے بیزاری۔ ۱۸۳۰ء سے دونوں تحریکیں ایک ساتھ نشو نما پاتی رہیں۔ ان تحریکوں کا مرکز
کو یونیورسٹی تھا جہاں فلسفیانہ، تاریخی، ادبی اور سماجی موضوعات پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

بعد کے زمانے میں روسی فکر نے مذہب کی جو مخالفت کی اور آزادی کی جدوجہد جس مقام تک پہونچی، اس کی تہ
محبت کا جذبہ اور الٰہی حکومت قایم کرنے کی آرزو تھی۔ بولشویکی مادی فلسفے میں مذہبی معتقدات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے
ن روس کے تعلیم یافتہ طبقے نے بولشویک انقلاب کے لئے جو راستہ ہموار کیا وہ اصلاً عیسوی تعلیم ہی کا نتیجہ تھا۔ جلاوطنو
پتائیں، دہشت انگیزوں کی جانبازیاں، نہلسٹوں کی قربانیاں ان سب کا سرچشمہ عیسویت کی تعلیم تھی، اور بلاشبہ
ی قربانیاں پھیل لائیں۔ الغرض اس کا مذہبی رجحان اس کو ہمیشہ حقیقی و واقعی انسان اور انسانی سماج پر فکر و غور

کرنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔

تمام بڑے روسی مفکر جیسے دوستویافسکی و ٹالسٹائی وغیرہ اگر بڑے صناع تھے تو یہ کوئی اتفاقی بات نہ تھی، کیونکہ روس میں سیاسی فکر و شعور ادب ہی کے دروازے سے داخل ہوا، اور ان کے سوچ بچار پر عمل کا گوشت پوست بہت جلدی چڑھ جاتا تھا۔ اسی لئے روسی قوم جو بیرونی حملوں کو پسپا کرنے فوراً اُٹھ کھڑی ہوتی تھی، اب اپنے مستبد حکمرانوں کے خلاف بھی جد و جہد کرنے لگی۔

اٹھارھویں صدی میں امیلیان بوگاچیف، ایک روسی کازاک نے حکومت کے خلاف جھنڈا اُٹھایا اور وولگا علاقے کے زرعی غلام اور جو رآل کے مزدور جاگیرداری نظام کا تختہ اُلٹ دینے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان انقلابیوں میں یہ انقلاب اگرچہ کامیاب نہیں ہوا مگر اس کے اندر کافی قوت تھی۔

اب روس کے اندر کافی علمی روشنی آچکی تھی، اور خود اشراف کے طبقے میں جمہوری تصورات پھیل چکے تھے۔ چنانچہ اشراف اور نوابوں ہی کے اندر سے ایسے لوگ نکلنے لگے جنھوں نے زار کی مستبد حکومت کے خلاف احتجاج شروع کر دیا۔ الیگزنڈر رادیشیف اونچے طبقے ہی کا ایک فرد تھا۔

رادیشیف، بلند پایہ ادیب اور فلسفی تھا جو جمہوریت کے اصول پر روسی قوم کی حقیقی سیاسی آزادی کے لئے تمام عمر برسرپیکار رہا۔ اس نے سیاسی آزادی اور انفرادی حقوق کی حمایت میں ایک اپیل کی اور یہی اپیل روس کی پہلی انقلابی جماعت دسمبری (DECEMBERISTS) پیدا کر دی۔ اس جماعت کی تعلیم و تبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ ترقی پسندانہ خیالات بہت تیزی سے پھیلنے لگے، استبداد سے تنفر عام ہو گیا اور حریت پرستی کی آبیاری ہونے لگی۔

جب کبھی روسی قوم کو بیرونی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، روسی شعراء اور ادبا نے بڑی مدد کی۔ چنانچہ اس موقعہ پر بھی پشکن نے "قصیدۂ حریت" لکھ کر عوام کے جمہوری حقوق کو مقدس چیز بنا دیا۔

یہی تعلیم و تلقین تھی جس نے ۱۸۱۲ء میں نپولین کو شکست دی اور جب ۱۸۲۵ء میں دسمبری جماعت نے انقلاب برپا کیا تو اس کے اندر وہی لوگ تھے جو ۱۸۱۲ء میں نپولین کے خلاف اپنے وطن کی کامیاب مدافعت کر چکے تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ دسمبری جماعت کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے والی چیز یہ نپولین کا حملہ تھا۔

۱۔ پیٹر شادائیف (۱۷۹۳ء سے ۱۸۵۶ء) روس کا پہلا اوریجنل مفکر تھا۔ وہ پاپائے اعظم کا مقلد تھا۔ ہر چند کتابیں تو اس نے چند ہی لکھیں، لیکن جتنا کچھ لکھا اس کا ایک ایک لفظ آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت بن گیا۔ اسکی تصنیف "فلسفیانہ خطوط" کا پہلا خط اثر و نفوذ کے لحاظ سے ایک بم بٹھنے کے واقعے سے کم نہ تھا۔ اسی بنا پر وہ رسالہ بند کر دیا گیا اور شادائیف کو مقید کر دیا گیا۔ ہر چند یورپ کے لوگ اس کے مذہبی عقاید کے قایل نہ تھے، لیکن اس کو ایک شہید کا درجہ دیا گیا۔

۲۔ فاریان ہرزن (۱۸۱۲ء سے ۱۸۷۰ء) سوشلزم پر عقیدہ رکھتا تھا لیکن مغربی یوروپ کی "فرسودہ تہذیب" اور اسکی "زوال زدہ انسانیت" کو اُکھاڑ پھینکنے والا سوشلسٹ نہیں تھا۔ وہ عیسوی تعلیمات کے اندر سماجی انقلاب کے قدرتی ارتقاء کا قایل تھا۔ الحاصل، روسی مفکروں اور جمہوری و سیاسی خیالات کے فلسفیوں میں ہرزن کا پایہ بلند ہے۔

اُنیسویں صدی کے ساتھ روسی قوم کے اندر اہل فکر و قلم کی ایک جماعت نمودار ہوئی، جس نے رادیشیف کی قایم کی ہوئی جمہوریت کی روایات کو زیادہ عام کیا۔ پشکن، سرمانتوف، گوگول، شادائیف، خمیاکوف، ہرزن، چرنی شیفسکی پلانشوف، دوبرولیولاف، بلینسکی، ٹالسٹائی دوستویافسکی اور پھر چیخوف، گورکی، یہ تمام کے تمام صحیح معنے میں قوم پرست

اور روس کے سماجی مفکر تھے، جن کے افکار نے قوم کی خصوصیت کو پرکھا اور ان خصوصیات کا احساس و شعور بخشا۔

۲۔ فاریاں بیلنسکی (۱۸۱۰ء سے ۱۸۴۸ء) "روسی ڈنشوروں کا باپ" کہا جاتا ہے۔ روس کے بے شمار ادیبوں اور صحافیوں میں یہ پہلا آدمی تھا جس نے روس کے ترقی پسند ذہنوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ بیلنسکی کسی ایسے مذہب کا قایل نہیں تھا جو "عاقبت کی امیدوں پر اس دُنیا کے وجود کو بے معنی بنا دے!"

اس بات کو کہ دُنیا کی قوموں کی تاریخ میں روسی قوم کا درجہ و مرتبہ کیا ہے، بیلنسکی کہتا ہے :-

"ہم روسیوں کو اپنی قومی اہمیت پر ہرگز کسی قسم کا شک نہ ہونا چاہیئے، تمام سلافی قبیلوں میں ہم روسی ہی ایک عالی شان اور مضبوط سلطنت قایم کر سکے ہیں۔ بلاشبہ ہماری ایک قومی زندگی ہے، اور ہمارا قومی منصب ہے کہ ہم دُنیا کو اپنا پیغام پہونچائیں! لیکن ہمارا یہ پیغام کیا ہوگا؟ یہ بات ہم آج نہیں بتا سکتے کہ دُنیا کے لئے ہمارا پیغام کیا ہوگا۔ ہمارے اس قومی پیغام کا علم ہمارے پوتے پردتوں کو ہوگا، اور دُنیا انھیں کی زبان سے ہمارا وہ پیغام سُنے گی ..... مجھے اپنی اس نسل پر رشک آتا ہے جو ۱۹۴۰ء کا زمانہ دیکھے گی! ۱۹۴۰ء میں روشن خیال دُنیا کا رہنما ہوگا اور سائنس و صناعت کے ضابطے اور قاعدے بنا کر متمدن دُنیا سے عزت کا خراج اور احترام کا ہدیہ وصول کرے گا۔"

۳۔ الیگزی خمیاکوف (۱۸۰۴ء سے ۱۸۶۰ء) ایک بلند پایہ فلسفی اور فلسفۂ تاریخ کا بڑا زبردست عالم تھا۔ انسانی خصوصیات اور اس کی آزادی کو سامنے رکھتے ہوئے خمیاکوف کا کہنا ہے کہ ایک اچھے اور حقیقی سماج کے افراد کو صرف حکومتی اعتبار سے متحد نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس ایجاد میں افراد کی رضا و رغبت اول شرط ہے۔

خمیاکوف کہتا ہے کہ جب فرد یا قوم ایک دوسرے کے لئے وقف نہیں ہو جاتے اور قربانی سے انکار کرتے ہیں تو وہ فرد یا جماعت از خود تاریخ کے دائرے سے نکل جاتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"جو شخص اپنی زندگی دوسروں کے لئے تج دینے کو طیار رہتا ہے، صرف وہی اپنی اور اپنی قوم کی روح کو محفوظ و سلامت رکھ سکتا ہے!"

خمیاکوف اس ضابطۂ اخلاق اور ضابطۂ قانون کو ناقص کہتا ہے جس کے اندر انسانی محبت کو جگہ نہیں دیگئی ہے۔ انسان اگر محبت نہیں کرتا اور صرف اپنی ذات میں جیتا ہے تو آزادی و مساوات جو اس کو اخلاق اور قانون سے ملی ہے اس کے لئے بیکار ہے اور اس کے باوجود اس کی زندگی جہنم ہے! محبت کے بغیر انسانی روح کی تمام قوتیں سماجی تباہی میں فنا برباد ہو جائیں گی۔ انسان اگر محبت کرنا نہیں سیکھتا اور دوسرے انسانوں سے مل کر مشترک مقصد نہیں بناتا تو ایسے وہ نظر نہیں پیدا ہو سکتی جو اس دُنیا میں رام راج لانے کے لئے ضروری ہے!"

خمیاکوف کے خیالات نے اس کے ہم عصروں پر گہرا اثر ڈالا، اور اگرچہ کلیسا اس کے مذہبی تصورات سے متفق نہیں ہو سکا روسی مفکرین نے اس کا پورا پورا اتباع کیا۔

۴۔ ولادی میر سولوفیف (۱۸۵۳ء سے ۱۹۰۰ء) ماسکو کے اونچے کلچر والے طبقے کا فرد تھا، وہ سلافیت کا مبلغ اور آرتھوڈوکس پارک تھا، گہری مذہبیت اور اخلاق پرستی کا قایل۔ مذہب اس کی نظر میں "انفرادی انسان کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی عقیدہ و عمل ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں یعنے روحانی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی منطقوں پر محیط ہے!" اس کا عقیدہ تھا کہ انسان کی تمامی حرکت و عمل خواہ وہ جسمانی محنت و مشقت ہو یا تخلیقی صناعت، اگر اس کا نتیجہ انسانی فلاح کی صورت میں نکلتا ہے اور اس سے انسان کے اندر احتیاج پیدا ہوتی ہے تو ایسی حرکت و عمل ایک لعنت ہے!

اس کا ایک قول یہ بھی ہے کہ خدا پر عقیدہ رکھنے والے انسان پر وہ اعمال فرض ہیں جو جسم اور روح کی محنت سے فطری عناصر کو تخلیقی شکل میں بدل دیں!۔ وہ اس دُنیا میں آسمانی بادشاہت لانا چاہتا تھا! اور اس طرح وہ جتنا بڑا مذہبی مفکر تھا اتنا ہی زبردست سماج سدھار کا بھی حامی تھا۔

۶۔ دوستویافسکی (۱۸۲۱ء سے ۱۸۸۱ء) کی متصوفانہ جمہوریت پرستی، کئی پہلو سے سولوخیف کی تعلیمات سے مماثل ہے دوستویافسکی کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ اس دُنیا میں آسمانی بادشاہت قایم کرنا روسی قوم کا مقدر ہے!۔ دوستویافسکی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سخت ہولناک حالات میں بھی وہ اپنے خیال اور عقیدے پر مستحکم رہا۔ وہ کہتا ہے کہ:۔ "ہمارا کام یہ دیکھنا ہے کہ سچی سوشلزم کی علمبردار روسی قوم ہو، دوسری نہ ہو!

روسی کردار کے متعلق اس کا فیصلہ یہ تھا:۔

"روسی، پوری نوع انسان سے محبت کرتا ہے۔ انسان کسی رنگ اور نسل کا ہو، کسی ملک کا رہنے والا ہو، روسی کو اس سے ہمدردی ہے، روسی کو ذرا سی بھی عقل و حکمت مل جاتی ہے تو وہ اسے دوسرے انسانوں میں بانٹ دینا چاہتا ہے"

۷۔ فیودروف کے یہاں مرکزی مسئلہ موت کا مسئلہ ہے۔ تاریخ انسانیت میں موت کا خیال اس کے لئے نہایت تکلیف دہ چیز تھی۔ وہ انسان کو دعوت دیتا ہے کہ موت تمام بُرائیوں کی جڑ ہے اور اس کے سامنے کبھی ہار نہ مانو! وہ مری ہوئی انسانی نسلوں کو زندہ کرکے موت پر فتح پالینے کا آرزومند تھا!

وہ سمجھتا تھا کہ انسان، حال، ماضی اور مستقبل کی تباہیوں کے بغیر دوامی زندگی پاسکتا ہے۔

۸۔ فیلی روزانوف (۱۸۵۶ء سے ۱۹۱۹ء) کا مرتبہ روسی ادب میں وہی ہے جو انگریزی ادب میں ڈی ایچ لارنس کا ہے، وہ اخلاق، ضبط و نظم اور روایات کا مخالف تھا۔ اس کے بعض اقوال ملاحظہ ہوں:۔

"ہر چیز لافانی، دوامی اور زندہ ہے! جوتے کے تلے کا سوراخ اگر گھٹتا بڑھتا نہیں تو روح کی لافنائیت سے بہتر ہے، اس لئے کہ روح محض خیال اور خشک تصور ہے!"

"جب میں دوسرا جنم لوں تو میری جیب میں رومال ضرور ہونا چاہئے۔ اس سے کم پر میں راضی نہ ہوں گا!"

"(دوسرے عالم میں) میں خدا سے کہوں گا کہ اس نے مجھے دُنیا میں کیا دیکھنے کو بھیجا تھا؟ کیا اس لئے کہ اس کی بنائی ہوئی دُنیا بہت حسین و دلکش ہے؟ نہیں! تو پھر میں اس سے کیا کہوں گا؟ خدا مجھے خموشی سے آنسو بہاتا اور کبھی کبھی مسکراتا دیکھے گا، مگر میرے مونھ سے ایک لفظ نہیں سنے گا!"

اس کے غور و فکر کا مرکزی نقطہ "طبعی انسان" کا نظریہ تھا۔ روزانوف ہمدردی، ترحم اور تلطف کو ہر بات سے اوپر جگہ دیتا تھا۔ سماجی اور اخلاقی خوبی کا مفہوم اس کی نظر میں فطری و فوری لطف و کرم کے اندر تھا۔ عالمگیر اتحاد و اخوت کی صورت میں اگر عیسویت اس کو لبھاتی تھی تو دوسری طرف وہی عیسویت اس کی جنسی زندگی کے تصورات کے خلاف ہونے کے باعث اس کو ڈھکیل بھی دیتی تھی۔ لیکن خود اس کی پیشگوئی کے مطابق انجام اس کا عیسویت ہی پر ہوا

۹۔ لیو ٹالسٹائی (۱۸۲۸ء سے ۱۹۱۰ء) حق و انصاف کے دوسرے جانبازوں کی طرح ٹالسٹائی کو جلاوطن تو نہیں ہونا پڑا لیکن اپنے ماحول کے سماجی جیلخانے میں بند ہوکر اس نے خود گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ ٹالسٹائی نے بکثرت ادب پیدا کرکے وطن، قوم اور دُنیائے انسانیت کی عظیم الشان خدمت کی، آج دنیا کے کسی حصہ کا فکر و خیال اپنے آپ کو ٹالسٹائی کے تصورات و نظریات سے علٰحدہ نہیں کرسکتا۔ اس نے اپنے ادب کے ذریعہ سے کلیسا کی سخت تنقید کی۔ اس کے باوجود اسے روس کا ایک سینٹ یا ولی مانا گیا۔

بیسویں صدی کے شروع میں جبکہ ایک عظیم الشان سماجی انقلاب کے آثار پیدا تھے، روسی قوم کے مسیحی ضمیر نے
ئی کا روپ دھار لیا تھا اور یہ بات اس امر کی شہادت تھی کہ زندگی اور انجیل میں بڑا تضاد ہے! ٹالسٹائی بھی
اور زندگی کے درمیان تفاوت دیکھ کر نہلسٹ بن گیا تھا، لیکن یہ خاص روسی قسم کا نہلزم تھا۔ دُنیا میں دوسری
شکل سے ایسی ملے گی جو حد درجہ صناعت پسند ہونے کے باوجود تہذیبی قدروں اور سماجی روایتوں کی طرف سے
بے پروا ہو جتنی روسی قوم ہے۔ روسی قوم کسی ایسے خیال کے لئے جو انسان کی دوامی نجات کا ضامن ہو سکے
ایسے انقلاب کے لئے جو کوئی مکمل سماجی نظام بنانے کا ضامن ہو سکے، ہر چیز اور ہر بات کو حقیر اور ہیچ سمجھے گی۔
ٹالسٹائی کی آرزو کسی نئی تہذیب کی نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کی تھی، وہ انسانی وجود کی کایا پلٹ دینا چاہتا تھا۔
جودہ تہذیب و تمدن کو اپنے پورے صناعتی ذخیرے کے ساتھ ملزم گردانتا تھا، جدید تمدن پر ٹالسٹائی کو غصہ
س اس تضاد کا نتیجہ تھا جو اس کے تعمیری و تخریبی عناصر کے مابین پایا جاتا تھا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ٹالسٹائی کے
ے جو حقیقت تھی وہ اتنی ہیبت ناک تھی کہ ٹالسٹائی انسان کی بیمار سیاست سے مایوس ہو گیا تھا وہ صرف اُسکے
یں بلکہ دنیا بھر کے لئے پیغمبرانہ فیصلہ دینے آیا تھا!

اس میں شک نہیں کہ روسی فکر و خیال کی بنیاد اس کا مذہبی عقیدہ ہے۔ روسی تفکر میں انسانی اخوت و مساوات
حلیم محبت ہی کا نتیجہ ہے؛ روسی فکر و احساس کی انتہا یہ ہے کہ وہ کسی کو مبتلائے آفات دیکھ کر آرام نہیں پا سکتا
قوم کا اخلاقی شعور انسانیت پرستی کو مجرد قدروں اور تصورات (جیسے اسٹیٹ، تہذیب، سائنس، اخلاق بلکہ
ت و جمال اور نیکی) سے بھی بلند و برتر مانتا ہے۔

پشکن، روس کا بلند پایہ شاعر و ادیب تھا اور نئے روسی ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ روسی سماجی فلسفے کی تبلیغ
ت میں پشکن کو ہرزن پر بھی فوقیت حاصل ہے جس کی جد و جہد کسانوں کی آزادی کے لئے بہت کامیاب ثابت
پشکین کے زمانہ تک روس کے اندر سیاسی تحریک کافی طاقتور ہو چکی تھی۔

پشکین کے دور کے بعد چرنی شیفسکی کا نام آتا ہے۔

انقلابی جد و جہد کو ہرزن نے جس مقام پر پہونچا دیا تھا، چرنی شیفسکی نے اس کو تیز و تند بنا دیا۔ طلباء کی جماعت
مرتبہ اُس نے متاثر کیا، اور طلباء کی سیاسی بیداری اتنی تیز تھی کہ انھوں نے ایک زبردست ہڑتال کی اور
شیفسکی کو سائبیریا بھیجدیا گیا۔

چرنی شیفسکی نے ایک اور اعلان شایع کیا جس کا عنوان تھا "گریٹ رشین"۔ اس اعلان میں اس نے دستوری
حکومت، آزادی تحریر، اور اقلیتوں کے حقوق کا مطالبہ کیا تھا۔ اس اعلان کے شایع ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس کی
قومیں پھر ایک دفعہ بین المللی اتحاد پر مستحکم ہو گئیں، اور بالآخر یہی اعلان قومی آزادی حاصل ہونے کی بنیاد ثابت
ٹالسٹائی کی تصانیف میں حاجی مراد کا کردار ایک مشہور ادبی کردار ہے۔

یہ بات دوہرا دینا شاید بے محل نہ ہو کہ روس کی تحریک جمہوریت اس کے سماجی تفکر کا نتیجہ تھی، اور ان کے سماجی
ی بنیاد ------ دسمبری جماعت روس کی پہلی منظم سیاسی جماعت تھی جس کے اندر سے نراجی فرقہ نکلا، اور
دسمبری جماعت سوشل ڈیماکریٹ پارٹی میں منتقل ہو گئی تو نراجی فرقہ فنا ہو گیا، اس لئے کہ روس کا قومی تفکر تشدد کی
نہ کرتا تھا۔ بالآخر سوشل ڈیماکریٹ پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ بولشویک (اکثریت) اور مینشویک (اقلیت)
۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سول وار نے مینشویک پارٹی کو ٹھنڈا کر دیا اور بولشویک جماعت بالآخر کمیونسٹ

پارٹی کہلائی۔ لیکن ان مدارج ارتقاء میں ہر جماعت اپنی پیشرو جماعت کے سیاسی پروگرام اور اعلیٰ تصورات کو آگے بڑھاتی رہی ۔ روسی غور و فکر کا محرک بلاشبہ مذہبی عقیدہ تھا، لیکن جب استبداد کے خلاف جدوجہد شروع ہوئی اور اہل کلیسا نے مذہبی اصول کے خلاف استبداد کی حمایت کی تو روسی اہلِ فکر مذہب سے بیزار ہوتے گئے، یہاں تک کہ جب لینن کا زمانہ آیا تو اس نے مذہب کو "عوام کی افیون" بتایا۔ اس کے باوجود ان کا سماجی تصور "آسمانی بادشاہت" یعنے انسانیت پرستی رہا، جو نظام نوع انسان میں اخوت و مساوات پر قایم ہو، جہاں بیروزگاری مفقود ہو، جہاں گناہ کی تجارت اور بھیک کا پیشہ جرم ہو، جہاں ہر چیز عوام الناس کی ملکیت ہو، جہاں بغض و نفرت اور حرص و آز باقی نہ رہے اور جہاں فرد سماج کے لئے کام کرے اور سماج فرد کی خیر و بہبود کی ذمہ دار ہو، جہاں علم اور کلچر عوام کی ملکیت ہو کر عام ہو جائے، بلاشبہ "آسمانی بادشاہت" جو آسمانوں سے نہیں اتری بلکہ زمین پر رہنے والوں کے ہاتھوں نے بنائی ہے۔

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم نے روسی عوام کے سیاسی شعور کو بالغ بنا دیا اور روس کی تمام قومیں جمہوری آزادی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ۱۹۱۷ء کا انقلاب کامیاب ہونے کے ساتھ لینن اور اسٹالین کا اعلان حریت شایع ہوا، جس نے قوموں کو کلی طور پر آزاد و مختار بنا دیا۔

مغربی یورپی حکومتوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں حق خود ارادیت (سیلف ڈٹرمی نیشن) کا خوب ڈھول پیٹا اور جنگ ختم ہونے پر اس عالمگیر اصول کو برف خانے کے اندر محفوظ کر دیا۔ لیکن اس کے برخلاف سوویٹ روس نے اس اصول پر حرف بحرف عمل کر کے اسے زندۂ جاوید بنا دیا۔

اسٹالین نے حق خود ارادیت کی تعریف اس طرح کی ہے :-

"مزدور طبقے نے سب قوموں کی آزادی کے لئے جنگ کی اور آیندہ بھی کرے گا۔ قوموں کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹی بڑی قوم کو اپنا مقسوم خود بنانے کا کامل حق حاصل ہے، اور کوئی دوسری قوم اس قوم کی زندگی میں مخل ہونے کی مجاز نہیں ہے! ایک قوم دوسری قوم کے کلچر کو نقصان پہونچانے، زبان کو پابند بنانے اور تعلیم کو مقید کرنے کا بھی حق نہیں رکھتی"

روس کی محکوم قوموں نے سوویٹ طاقت کے اس اعلان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور سب قومیں سول وار میں روس کے جمہوری انقلاب کی معاون رہیں۔ اور پھر پانچ سال کامل خود مختار رہنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں بہ رضا و رغبت روسی وفاق میں شامل ہو گئیں جس کو آج کے نام سے جانتے ہیں۔

سوویٹ یونین کا یہی وفاق وہ "آسمانی بادشاہت" تھی اور حریت و مساوات کے ان خوابوں کی سچی تعبیر جو ہر زمن سے لیکر چیخوف و گورکی تک روس کے تمام سماجی مفکر دیکھتے آئے تھے!

چیخوف اسی سماجی نظام کا مبلغ تھا۔ وہ ساری عمر ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج اور انسانی حقوق کی حمایت کرتا رہا۔ سماج کا جتنا مکمل نقشہ چیخوف نے پیش کیا ہے دوسرے اہلِ قلم سے ممکن نہ ہوا۔ چیخوف کے ادب و انشاء نے روسیوں کو زیادہ پاکیزہ و متدین بنایا اور انسانی شرافت کا معیار خدمت بنی نوع انسان کو قرار دیا!

میکسم گورکی لبرل روس کی پیداوار تھا۔ روسی فکر میں گورکی کا درجہ کسی سے کم نہیں ہے۔ گورکی کے متعلق دی وی میخالوفسکی لکھتا ہے کہ :-

"..... اس کا تخلیقی کام انیسویں صدی کے بہترین روسی ادب اور نئے سوویٹ ادب کو جوڑنے والی کڑی ہے

حالانکہ گورکی خود سوویٹ ادب کا بانی بھی ہے! گورکی کے اندر قدماء کی تمام صفتیں جمع ہوگئی ہیں، پشکن کی جامعیت، سرمانتوف کی حریت پرستی، ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کی شدت احساس اور گہری اخلاقی جستجو، نیکراسوف کی مظلوموں کے ساتھ گہری ہمدردی، چیخوف کی انسانیت اور پرمعنی زندگی کی آرزو، یہ سب اوصاف گورکی کے اندر جمع ہوگئے تھے!" گورکی کو نوع انسان سے کتنی محبت تھی، اس کے بیان کرنے کو دفتر چاہئے مگر اہلِ نظر اس کے ایک فقرے سے ہ کرسکیں گے:-

"انسان! اس لفظ میں (افتخار و مکرمت کی) کیسی گونج ہے!"

انسانیت پرستی میں گورکی کو اتنا غلو تھا کہ اس کو "جارحانہ" انسانیت پرستی کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس کی یہ انسانیت سوویٹ فکر و ادب کا پرچم بن گئی اور وہ مفکروں اور ادیبوں کی نئی نسل کا معلم اعظم قرار پایا۔

اسٹالین دُنیا میں اگر اور کچھ نہ کرتا تو بھی اس کی "قومیتوں کے متعلق سوویٹ پالیسی" ہمیشہ اس کو دُنیا کا دی ثابت کرنے کو کافی تھی۔ لینن جس طرح مارکس کا شارح تھا، اسٹالین اسی طرح لینن کا مفسر ہے۔ اگر دوسری تنظیم نہ ہوتی تو شاید دُنیا اس حقیقت سے بے خبر رہتی کہ اسٹالین، مارکس و لینن کے فلسفے کو عملی سانچے میں ڈھال ہے، ایک بلند پایہ سیاست داں ہے، ایک اعلیٰ سپہ سالار بہت بڑا مدبر سلطنت بھی ہے۔

روس کے اندر اگر اسٹالین کے حریف ٹراٹسکی کی یہ پالیسی مان لی جاتی کہ دُنیا بھر میں انقلاب پیدا کرانے کی کوشش ی رکھی جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ نیا روس آج کسی قعرِ مذلت میں پڑا ہوتا! اگر اسٹالین کی اس عاقبت اندیشی پر کیا گیا ہوتا کہ ایک اشتراکی حکومت پہلے اس قدر قوی بنالی جائے کہ دُنیا کی تمام سرمایہ داری طاقتوں کے متحدہ حملے کی کرسکے، تو کون انکار کرسکتا ہے کہ روسی قوم اور اس کے ساتھ ساری دُنیا آج ہٹلر اور فاشیت کی غلامی میں جکڑی ہوتی۔ اس حقیقت کا اعتراف دُنیا نے کیا ہے کہ روسی اہل قلم و اہل فکر اپنے عوام سے جتنا قریب رہتا ہے اس کی مثال اور نہیں ملتی۔ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ ایک معیاری دُنیا کیسے بنائی جاسکتی ہے؟ اس دُنیا میں روس کے لئے سی جگہ ہوگی؟ ان کے سامنے یہ بھی سوال تھا کہ روس آنکھ بند کرکے مغربی یورپ کے پیچھے ہولے یا ایسا نہ کرے روسی قوم بجائے خود ایک کلچر مدون کرسکتی ہے؟

یہ وہ اہم اور بنیادی سماجی مسئلے تھے جن پر روسی مفکر ہمیشہ اور مسلسل دماغ سوزی کرتے رہے۔ روس کی تمام ی تحریکیں اسی غور و فکر کا نتیجہ تھیں۔ اولاً م قسم کے خیالات اُبھرے پھر پور اصطلاحی تصورات مشکل ہوئے اور لافیت" کا رجحان بڑھا۔ الیگزینڈر دوئم کے عہد تک خیالات کی جو تخم ریزی ہوئی اس کا ماحصل زرعی غلامی کا ہ تھا۔

اس کے بعد تعلیم یافتہ طبقے میں سیاسی شعور نمودار ہوا اور طلبہ کی جماعت میں سے نراجی فرقہ پیدا ہوا۔ یہ تحریک ب روس کی ابتداء تھی۔ ٹالسٹائی کا زمانہ "جھٹ پٹے" کا زمانہ کہا گیا ہے، کیونکہ اس دور میں سوشل ڈیماکریٹ پارٹی ہو رہی تھی جس کے اندر سے بولشویک پارٹی نکلی جو آج کمیونزم پارٹی کہی جاتی ہے۔

انیسویں صدی میں بیلنسکی نے جو پیشگوئی کی تھی وہ ۱۸۱۷ء کے انقلاب سے پوری ہوئی اور ۱۸۴۰ء کی جس روسی پر بیلنسکی نے رشک کیا تھا وہ نسل ۱۸۴۵ء میں وہی کر رہی ہے جو سو سال پہلے بیلنسکی کی دوربین نظر نے دیکھ لیا تھا

ل۔ احمد

# فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

**مایا قوم کا رسم خط** مایا قوم وسطی امریکہ میں آباد ہے۔ کولمبس کی دریافتِ امریکہ سے پہلے اُس نے بڑا عروج حاصل کیا تھا۔ یوکاتان سے لیکر سیلویڈر تک اُس کا تمدن پھیلا ہوا تھا لیکن ازتیق قوم نے اُسے شکست دی جس کے بعد مایا قوم کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

مایا قوم میں ایک تصویری رسم خط مستعمل تھا جسے پڑھنے میں ابھی تک مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے۔ جہاں تک پتہ چلتا ہے ان لوگوں میں حروف کا رواج نہ تھا۔ ہر نشان ایک لفظ یا تخیل کو ظاہر کرتا تھا۔ ایسے نشانات میں دیوتاؤں۔ تقویم۔ چہار جہت، سیاروں اور رنگوں وغیرہ کی علامات شامل ہیں۔

مایا قوم کے سال میں ۱۸ مہینے اور ہر مہینے میں ۲۰ دن ہوتے تھے اس طرح اُن کا سال (۲۰ × ۱۸) یعنی ۳۶۰ دن کا ہوتا تھا۔ ہر مہینے اور ہر دن کو ظاہر کرنے کے لئے علٰحدہ علامتیں تھیں، اس سال میں بعد ازاں ۵ دنوں کا اضافہ کیا گیا۔ جنھیں منحوس مانا جاتا تھا۔ اُنھیں "یوآیب" کہتے تھے اور اُن کے لئے بھی ایک علٰحدہ علامت تھی۔ نیچے "مایا مہینوں کی علامتیں" درج کیجاتی ہیں:

اُنھوں نے اپنی تقویم کا حساب ۴۰۰ سال کی مدت میں محدود کیا تھا جس کی منزلیں اور اُن کے نشانات یہ تھے:-

## ازتیق قوم کا رسم خط

ازتیق (AZTEC) قوم میکسکو میں آباد تھی - اُس کا آخری بادشاہ ماٹی زیوما تھا جسے اسپین کے لوگوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے گرفتار کر لیا اور میکسکو کی سلطنت پر قابض ہو گئے - یہ ۱۵۲۱ء کا واقعہ ہے -
ان کا رسم خط غالباً مایا رسم خط کی ایک بگڑی ہوئی صورت تھی - نیچے دی ہوئی تصویر اس لکھائی کا ایک اہم نمونہ ہے :-

اس میں " ازتیق قوم کی ہجرت " کو دکھایا ہے - وہ ایک روایتی جزیرے ازتلان (لفظی معنی "مقامِ ازتیق") سے ہجرت کرکے "چقماق کے چاقو" کے پہلے سال مطابق ۱۱۶۸ء میں " ویت زیلوپوچتلی " نامی غار میں پہونچی اور وہاں سے اُن کے آٹھ قبیلے اپنے اگلے سفر پر روانہ ہوئے (تصویری کا اوپری حصّہ) نیچے گرے ہوئے درخت سے "تاموانکان" (منزل) مراد ہے - وہیں پر ایک قربانگاہ بنی ہوئی ہے جہاں وہ کھاپی رہے ہیں اور داہنی طرف اُنھیں ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہوئے دکھایا ہے - چلنے کے لئے نقشِ قدم اور بولنے کے لئے منھ کے پاس " و " کا ایسا نشان بنایا ہے - ہر قبیلے کا مخصوص نشان مکان کے ساتھ بنایا گیا ہے - لوگوں کے نام لکھنے کے لئے اُن کی علامتوں کو سروں سے ملا دیا گیا ہے - نام لکھنے کا بالکل یہی طریقہ ہنود احمر (ریڈ انڈین) میں رائج تھا۔

نیچے ازتیق رسمِ خط میں بعض مقامات کے نام ملاحظہ ہوں :-

کال تے پیک = کلّی (گھر) + تے پیک (پہاڑ)

کوتے پیک = کوتل (سانپ) + تے پیک (پہاڑ)

اتِزتے پیک = اتِز (کُتّا) + تے پیک (پہاڑ)

اتزتلان = اتِز (کُتّا) + تلانتلی (دانت)

مذتلان = مذتلی (بادل) + تلانتلی (دانت)

مازتلان = مازتل (ہرن) + تلانتلی (دانت)

مایا قوم کی طرح اُن کے سال میں بھی ۱۸ مہینے اور ہر مہینے میں ۲۰ دن ہوتے تھے یہاں پر اُن کے دنوں علامتیں نقل کی جاتی ہیں :-

کی پاکتلی (مگر)

اوزوماتلی (بندر)

ایہے کتل (ہوا)

مالن الّلی (گھاس)

کلّی (مکان)

آکتل (نرکل)

کویتذپلن (چھپکلی)

اوکے لتل (بلی)

کوتل (سانپ)

کوآؤہتلی (عقاب)

مکویزتلی (چہرہ موت)

کوزکاکوا وہتلی (گدھ)

مازتل (ہرن)

اولن (حرکت)

توچتلی (خرگوش)

تیک پتل (چقماق کا چاقو)

اتل (پانی)

کوآداتل (بارش)

آتذکوانتلی (کتا)

شوچتل (پھول)

نوٹ :- اس مضمون کے ساتھ تصویری رسومِ خط کا بیان ختم ہوجاتا ہے ۔ اس کے آگے سامی، یونانی، ہندوستانی (براہمی) رسومِ خط کا ذکر کرنا ہے ۔ جو بہت زیادہ تفصیل چاہتا ہے، علاوہ اس کے سامانِ ت، فنِ تحریر کے مستقبل اور اصلاح رسوم خط کے متعلق بھی مجھے بہت کچھ لکھنا ہے ۔ اس لئے فی الحال سلسلہ کو اسی جگہ ختم کردینا مناسب ہے ۔ اس کی دوسری کڑی آیندہ سال سے شروع کی جائے گی ۔

محمد اسحاق صدیقی


ب | حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی کیا حقیقت ہے اور دُنیا میں کیونکر رائج ہوا اس مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کا صحیح مفہوم کیا ہے قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول منیجر نگار

"گاہے گاہے باز خواں ——"

# ہمارے بُت کدے

## اور

# ان کے لات و ہبل

دُنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے بُت پرستی کی شدید مخالفت کی اور جسکے علمبرداروں نے اپنے آپ کو "بت شکن" کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پروا کی اور نہ بحرِ ہند کی گہرائیوں کی، وہ مورد ملخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کرکے اُٹھے، صرصر وسیل کی طرح نہ رُکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برق و الزلہ کے مانند ہر اس بتکدے کو تباہ و برباد کر گئے، جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اُٹھتا تھا "جنّتِ عدن" سے قریب تر کردینے والا ہوتا تھا اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بُت پر پڑتی تھی گویا قصرِ فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی، وہ مذہب جس کی بنیاد ہی "لات و ہبل" کی مسماری پر قایم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہئے تھا اور ہر سومناتھ کے لئے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہوجانا ضروری تھا۔ لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب مندر کے کسی گھنٹہ کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ ایک "بُت" کا تعلق انسان کے کن جذبات سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف گرز گراں اُٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف۔ "جُنبد کلیدِ بتکدہ در دستِ برہمن"۔

یونتو دُنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، بُت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک "ناتراشیدہ معبود" چھپائے ہوئے ہے، لیکن نہ بت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ "بُت شکن" اس پر اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔ کیوں؟ آئے آج کی صحبت میں اسی پر غور کریں۔ شاید تسبیح و زنار کی گتھیوں کو اس طرح سلجھا سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق "مادہ" سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے ہمیں اس دعویٰ کے صدق و کذب پر اسوقت بحث کرنا مقصود نہیں۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ "محض مادہ" کوئی قیمت نہیں رکھتا، اصل چیز جو اس کو باوقعت بناتی ہے وہ انسان کی ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے۔ مٹی یوں کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنا لیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہوجاتی ہے، لوہا اپنے معدن کے اندر بیکار ہے لیکن جب انسان اسے باہر نکال کر دوسری شکلوں میں تبدیل کرلیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے، سونا یوں کسی کام کی چیز نہیں، لیکن چونکہ ذہن انسانی نے اس کو معیاری قدر قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے۔ اس لئے وہ گراں ہے، الغرض مادہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص عملی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی، اس سے متعلق نہ ہو

بے کار شے ہے۔

اب اس نظریہ کو سامنے رکھکر ایک "بت" کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے "بت" فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا اس کو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا، وہ ایک حقیر پارۂ سنگ تھا جسوقت تک انسان کے جذبات کو اس میں مشکل نہ کیا تھا، لیکن ایک "بُت تراش" کی چھینی اور ایک "برہمن" کے جذبۂ عقیدت سے مس ہی وہ اس قدر مقدس ہوگیا کہ پیشانیاں اس کے سامنے جھکنے لگیں۔ اس لئے اگر "بُت شکنی" کا ہدف صرف وہ "پیکرِ سنگیں" ئے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہوسکتی، کیونکہ پتھر کو بُت بنادینے حقیر و ذلیل پارۂ سنگ کو "معبود" کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی اور وہ ہزار بُت شکنیوں بھی بدستور قایم رہ سکتی ہے ہاں اگر کسی مخصوص و متعین "بُت" کو توڑنے کے بعد کوئی دوسرا بت اس کی جگہ نہ لے سکے "بت شکنی" مفید ثابت ہوسکتی ہے، لیکن چونکہ بت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لئے اس بُتکدہ کو نہ توڑا جائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے، یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے جس نے بُت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی ور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود "لات و ہُبل" کی صرف مورتیوں کو مسمار کرکے خاموش ہوجانا نہیں اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تذلل پیدا کرتی ہے اور اسی لئے جب کسی بُت کو توڑا ا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک اور جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور جس کا اصطلاحی نام "خدا" ہے۔

انسان جسم ظاہری کے لحاظ سے یقیناً فانی ہے، لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر فانی ہے، انفرادی سے وہ چاہے کتنا ہی بے وجود ہو لیکن کلی و اجتماعی حیثیت سے وہ لازوال مقصودِ آفرینش ہے اور یہی وہ تھی جو بعض زبانوں سے "انا الحق" کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہرحال "بت پرستی" اگر انسان سے اس جذبۂ بلند کو محو کردینے والی ہے تو یقیناً نہایت مضرت رساں چیز ہے، کو یقیناً مٹ جانا چاہئے، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا اس وقت بھی نزاع کفر و دین کو جاری رہنا چاہئے اور ایک جذبۂ کو دوسرے کے جذبۂ بُت پرستی سے متصادم ہونا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دُنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑگئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جارہا ہ عقول انسانی کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہیں، میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم سامنے آیا ہے جس پر تمام نوع انسانی متفق ہوسکتی ہے اور یہی وہ دورِ عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے بے نقاب کرکے اس کے دلکش خط و خال نمایاں کردئے ہیں۔

مذہب ضرورت انسانی کی پیداوار تھی اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہئے، اول اول سان کی "اجتماعی حیثیت" محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطۂ نظر بھی ا، اور ہونا چاہئے تھا، لیکن اب کہ نظام تمدن نے وسیع ہوکر شرق و غرب کے امتیاز کو مٹا دیا ہے اور انسان تی ہیں "خلیفۃ اللہ فی الارض" بن کر سارے کرۂ ارض پر چھاگیا ہے، مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہئے، اس کے کو بھی بدلنا چاہئے اور اس کے اصول میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہئے تاکہ امتیازِ نسل و رنگ اور اختلاف مسجد سے بلند ہوکر تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لایا جاسکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعیات تک محدود رکھا جائے، جزا و سزا کا معیار، بہشت و دوزخ یا حور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اور اب خدا کا نام کسی ایسی قہار و جبار ہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرمانروا کی طرح دنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے، مذہب کا دور استبداد (Autocracy) ختم ہو گیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قایم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اس وقت صرف عالمگیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔

وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے۔ آج جو خدا عیسائیوں کا ہے وہی ہندوؤں کا ہے، جو ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے، اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے، اس کے الطاف سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اس کی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، اس کے حسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو مصور کر رکھا ہے اس کے نغموں نے ہر ہر شے کو مبہوت بنا رکھا ہے، وہ ذرہ ذرہ کے اندر سمایا ہوا ہے، وہ کائنات کی نبض میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے، عالم کون کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے وہ گویا ایک "مرکز المراکز" ہے جہاں پہونچکر ماضی، حال و مستقبل سب ایک ہو جاتے ہیں۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علٰحدہ قرار دے، اس کا کوئی جداگانہ تصور پیدا کر کے اپنے لئے مخصوص کر لے، مذاہب قدیمہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، لیکن اب وہ اس شکنجہ سے آزاد ہو گیا ہے اور اپنا معبد اس نے عقل انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحوش و طیور، انس و جن سیاہ و سفید، جاہل و عالم، شاہ و گدا سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوع انسانی اپنی تفریق کو محو کر چکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لئے مخصوص کر سکے، کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوا اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہو گی اور نوع انسانی کا ہر ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہو گا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک انعام خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے، اگر معصیت کی بناء پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں اور آپ بچ جائیں، اب تو یہاں دوزخ ہی رہے گی یا فردوس۔ اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑنا ہے۔ یہ دور اشتراکیت کا ہے، اجتماعیت کا ہے جب ہر چیز ایک کلی و عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی (Universality) حیات انسانی سے ہر ہر پہلو کو "کائناتی" بنا دینا چاہتی ہے، ہمارا خدا ہمارا معبد، ہمارا مذہب، ہماری عبادت، ہماری روحانیت سب کو "کائناتی" رنگ اختیار کرنا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصود آفرینش تھا جس کی تکمیل کا زمانہ اب آ رہا ہے۔

خدا اب مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا، اس کا مطالبہ اب یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اسے تلاش کیا جائے اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے، وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبدوں میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس معبد میں جو خود اسی کا بنایا ہوا ہے جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جھک جاتے ہیں اور وہ معبد انسان کا قلب و دماغ ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا۔ زنار و تسبیح کے امتیاز کا زمانہ ختم ہو گیا جن کو ہم بت سمجھ کر پوجتے تھے وہ خود ہم سے بیزار ہیں، اس لئے ہم کو بت پرستوں کی جستجو اجودھیا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہئے اور

ستارانِ خدا کی تلاش حطیم کعبہ سے باہر کہیں اور۔

دُنیا میں بُت پرستی اب بھی قائم ہے لیکن لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں، بُت شکنی اب بھی ضروری ہے لیکن ہ آہنی سے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بُت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں یہ بُت ہر جگہ موجود ہیں اور ف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ بُت تم کو خانقاہوں میں زرکار مسندوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے، تعلیمی اداروں میں قرآن و حدیث کا درس ے ہوئے ملیں گے۔ سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ان کی صورتیں نورانی ہوں گی، لیکن دل سیاہ، ان کی زبانوں پر خدا، رسول کا نام ہوگا لیکن صرف نمود و نمایش ئے ان کی تقریروں سے ملک و قوم کی محبت ٹپکتی ہوگی لیکن ان کا مقصود صرف اپنی ذات ہوگی۔ ان کی پیشانیوں ہ کا نشان، ان کی دامندار طویل قبائیں، ان کی عریض و طویل داڑھیاں، ان کی ہر وقت گردش کرنے والی سُمرنیں۔ کی وہ خصوصیات ہیں جن سے تم ان بتوں کو ہمیشہ آسانی سے پہچان سکتے ہو یہ خود کبھی سلام میں تقدیم نہیں کریں گے ی دوسرا سلام کرے گا تو جواب میں کبھی سر نہ جھکائیں گے، جب یہ کسی طرف سے گزریں گے تو ان کی زیارت کا ایک ہجوم کے ساتھ ہوگا، اور جب خانقاہوں کے اندر شہ نشینوں پر ان کو بیٹھا دیکھو گے تو یہ معلوم ہوگا کہ "خداوندِ بقا" اپنے وں کو دیدار سے مشرف کر رہا ہے۔

جس وقت یہ قرآن کا درس دے رہے ہوں گے تو سوا نحوی و صرفی نکات کے کوئی اور موضوع ان کے سامنے نہ ہوگا، ب حدیث پڑھا رہے ہوں گے تو اسماء رجال کی تحقیق ان کا انتہائی کارنامہ ہوگا، جب یہ منبر پر وعظ فرما رہے ہونگے سوا خدا کے قہر و غضب اور جہنم کے ہولناک مناظر کے وہ کچھ نہ بیان کریں گے، سیرۃ اکابر پر اظہار خیال فرمائیں گے سوا ان باتوں کے جو حماقتوں سے پُر ہیں کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکلے گا، فرشتوں کی باتیں، جنات کے افسانے، یزہ و کرامات کے واقعات اور اسی طرح کے دیگر مزخرفات ان کے مواعظ کی جان ہیں، اخلاق کا درس بھولے سے بھی دیں گے بھی تو وہ بہشت کی طمع، جہنم کے خوف سے خالی نہ ہوگا اور ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئے گی کہ لی کرنا ہر انسان کا فطری فرض ہے اور اسے خیال مُزدو تعزیر سے بہت بلند ہونا چاہئے۔

یہ اگر رواداری و ہمدردی کا درس دے رہے ہوں گے تو یقین رکھو کہ ضرور کسی نہ کسی کا حق غصب کر کے آئے ہیں اگر اہل و عیال کے ساتھ محبت و رافت کا وعظ فرما رہے ہوں گے تو باور کرو کہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو ٹھوکروں سے کر باہر نکلے ہیں۔ لوگوں کو سچ بولنے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ جھوٹ بولنے کا حق ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو، ز و انکسار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ آ آ کر ان کے قدموں کو بوسہ دیں۔

الغرض یہ ہیں وہ بُت جن کو اس وقت توڑنے کی ضرورت ہے اور یہ ہیں آج کل کے وہ "لات و ہبل" جن کو مار کرنا ہر انسان کا فرض ہے

---


## سالنامہ ۵۴ء (فرمانروایانِ اسلام نمبر)

ایت احتیاط سے روانہ کیا جائے گا، لیکن ممکن ہے وہ گم ہو جائے اور آپ کو نہ ملے، اس لئے اگر آپ کی خریداری دسمبر ۵۳ء میں ختم ہو رہی ہو تو
پ چندہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کرنا چاہتے ہیں تو ۶ر زاید مصارف رجسٹری کے لئے بھی روانہ فرمائیے اور اگر آپ کی خریداری دسمبر ۵۳ء میں ختم
یں ہو رہی تو صرف ۶ر کے ٹکٹ بھیج دیجئے۔ کیونکہ دوبارہ ہم مُفت فراہم نہ کر سکیں گے۔

منیجر

# عورتیں ہی عورتیں

## مستقبل کی دُنیا میں

### (جب تولید کے لئے جنسی تعلق کی ضرورت نہ ہوگی)

ماہرین حیاتیات کے سامنے تخلیق حیات کا مسئلہ ہمیشہ انتہائی توجہ کا باعث رہا ہے، نظریۂ تخلیقِ حیات کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ دُنیا میں "حیاتِ محض" کیونکر وجود میں آئی، اور دوسرے یہ کہ ارتقا و تنوع حیات کے لئے قدرت نے کیا وسایل و ذرایع اختیار کئے۔

مثلاً حیات محض کے وجود کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک وقت تھا جب زمین پر مادۂ تولید (پروٹوپلازم) ہر جگہ پھیلا ہوا تھا اور اسی سے خلایا ( ) بن بن کر کیڑے مکوڑوں کی صورت پیدا ہوجاتی تھی، لیکن جب حیات نے ترقی کرکے دوسری منزل میں قدم رکھا اور حیوانات وجود میں آئے تو اس کے لئے نر و مادہ کی تفریق، ان کا باہمی شہوانی تعلق اور مادۂ تولید کو ضروری قرار دیا گیا۔ چنانچہ ایک زمانہ اسی اعتقاد و یقین کی حالت میں گزر گیا اور اس نظریہ میں اگر کوئی ترقی ہوئی تو صرف اتنی کہ بغیر جنسی تعلق کے اگر جنسی ذکور کا مادّہ، کسی مادہ جانور یا عورت کے رحم میں پہونچا دیا جائے تو بچّہ پیدا ہوسکتا ہے چنانچہ اس کے تجربہ کئے گئے اور کامیابی ہوئی، لیکن اب فرانس کے ایک سائنسداں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے۔ اس نے اپنے تجربات سے ثابت کردیا ہے کہ بقائے نسل کے لئے مرد یا نر جانور یا اس کے مادۂ منویہ کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر دُنیا میں تمام نر جانوروں کو ہلاک اور مردوں کی جنس کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے، تو بھی مادہ جانور اور محض عورتیں تخلیق حیات کے سلسلہ کو جاری رکھ سکتی ہیں اور چونکہ ان سے صرف انھیں کی جنس کے بچّے پیدا ہوں گے، اس لئے ایک ایسے زمانہ کا تصور ناممکن نہیں، جب دنیا میں صرف عورتیں ہی عورتیں نظر آئیں اور مرد کا وجود کہیں نہ پایا جائے۔

اس چیز کا اصطلاحی نام Partho. genisis ہے۔ یعنی دوشیزگی میں بچّہ جننا جسے ہم "تولید غیر جنسی" کہہ سکتے ہیں۔

کئی سال پہلے بھی اس چیز کا تجربہ کیا گیا تھا لیکن اس سلسلہ میں نر کے مادّہ تولید کی ضرورت باقی رہتی تھی یعنی مختلف ذرائع سے مرد کا مادّہ تولید مادہ جانور یا عورت کے رحم میں پہونچا کر بچّہ پیدا کرتے تھے، لیکن اب اس فرانسیسی پروفیسر کے جدید تجربہ کی بنا پر نر یا اس کے مادّۂ منویہ کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس نے خرگوش، مینڈک اور بعض دوسرے گرم خون رکھنے والے جانوروں پر تجربہ کرکے "تولید غیر جنسی" کو ثابت کردیا ہے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ تجربہ نوع انسان پر بھی ٹھیک نہ اُترے اور ایک وقت ایسا آئے جب قدرت بقائے نسل کے لئے مرد کو

ضروری قرار دیکر اسے ہمیشہ کے لئے ختم کردے۔

اس سائنس داں کا خیال "تولید غیر جنسی" کی طرف سب سے پہلے ان بعض کیڑوں کو دیکھ کر پیدا ہوا جن میں نر و ہ کی کوئی تفریق نہیں ہے اور سلسلۂ تولید جاری ہے۔ وہ اس مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ تخلیق کا تعلق اصل چونکہ مادہ سے ہے، اس لئے ان کیڑوں میں اگر نر کا وجود کبھی رہا بھی ہوگا تو وہ ختم ہوگیا کیونکہ اس کی ضرورت تھی۔ اس مطالعہ کے بعد اس نے تجربات شروع کئے اور اس کی کامیابی کی تین مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔ ایک مادہ خرگوش کے ( ) یعنی نلوں پر روزانہ کئی دن تک اس نے برف ملی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اپنے مادّہ سے بچّہ جننا شروع کیا۔

۲۔ اس نے ایک کیمیاوی نمک پانی میں تحلیل کرکے پچکاری کے ذریعہ سے ایک چوہیا کے جسم میں پہونچایا اور بچّے پیدا ہوئے۔

۳۔ ایک مینڈکی کو نر مینڈک سے عرصہ تک علٰحدہ رکھا۔ لیکن اس نے پھر بھی انڈے دئے اور ان سے بچّے نکلے۔ لیکن یہ سب بچّے مادہ تھے، نر ان میں کوئی نہ تھا۔

جن مادہ جانوروں پر یہ تجربہ کیا گیا، یہ سب وہی تھے جو نر سے مادۂ تولید حاصل کرکے بچّے پیدا کرتے ، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ عورت پر بھی یہ تجربہ کامیاب ثابت نہ ہو اور پھر مستقبل بعید کے اس عہد کو سامنے رکھئے ب وہ اپنے بچّہ کی ولدیت کو کسی مرد سے نہیں بلکہ درجۂ حرارت کے اس فوری انحطاط سے منسوب کرے گی جو تولید وقت رونما ہوا تھا۔

خیر یہاں تک تو کوئی حرج نہیں، کیونکہ ممکن ہے عورت جذباتی حیثیت سے مرد کی ضرورت ایک خاص وقت تک سوس کرتی رہے، لیکن جذبات کے انحطاط کے ساتھ اس احساس کو بھی ختم ہوجانا ہے اور آخرکار اس وقت کا آنا روری ہے جب عورت مرد کو ایک غیر ضروری جنس قرار دیکر اس سے منھ موڑ لے گی اور قدرت بھی اس کا ساتھ دیکر کو بالکل ختم کردے گی، کیونکہ قدرت کا یہ قانون اٹل ہے کہ دنیا میں جس چیز کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اسے آخرکار کردیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بات بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہے اور ہم فی الحال اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، کیونکہ رے جنسی جذبات و تعلقات اتنے دیرپا ہیں کہ ان سے ہٹ کر ہم کچھ سوچ ہی نہیں سکتے لیکن سائنس کی دُنیا عجیب ۔ وہ ہم سے سوال کرسکتی ہے کہ زمانۂ قدیم میں جو بہت سے دیوپیکر جانور (دنیا سور وغیرہ) پائے جاتے تھے کہاں ۔ ڈوڈو چڑیا کی قوت پرواز ختم ہوکر کیوں فنا ہوگئی، اور اس وقت بھی بعض جانور کیوں کم ہوتے جارہے ہیں قدرت کا یہ قانون جانوروں پر صادق آتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس سے محفوظ رہے۔

زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔ صرف ۱۹۴۰ء کی بات ہے جب ڈاکٹر گریگوری نے گرم خون رکھنے والے جانوروں میں وش پر اس کا تجربہ کیا۔ انھوں نے نلوں پر برف مل مل کر اس کے مادۂ تولید کو اُبھارا اور اُس نے ایک بچّہ دیا۔ نر نہ تھا۔ چونکہ نر بچّہ کا پیدا ہونا اس مادّۂ تولید پر منحصر ہے جو نر کی طرف سے منتقل ہوتا ہے اور یہ مادّہ اسے ملا تھا اس لئے بچّہ نر نہ ہوا۔ اگر عورتوں پر اس کا تجربہ ہوا تو یہاں بھی یہی صورت پیدا ہوگی اور صرف لڑکیاں پیدا ں گی، یہاں تک کہ ایک دن دُنیا میں عورتوں کے سوا مرد کا کہیں نشان تک نہ ملے گا۔

فرانسیسی ماہر حیاتیات جین راسٹنڈ نے مینڈکیوں سے کئی نسلیں "تولید غیر جنسی" کی پیدا کی ہیں۔ اس نے

برف ملنے کے بجائے مینڈکیوں کے انڈوں کو لیا جو مینڈک سے علٰحدہ رہنے کے بعد انھوں نے دئے تھے اور اس نے ہر انڈے میں باریک سوئی چبھوکر ہلکا سا شگاف دیدیا۔

چونکہ طبعی حالت میں مینڈکی کے انڈوں سے بچے پیدا ہونے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مینڈکی جب انڈے دے چکتی ہے تو مینڈک آتا ہے اور انڈوں کے قریب اپنا مادۂ تولید پھیلا دیتا ہے یہ مادہ انڈوں تک پہونچکر ان میں سوراخ کردیتا ہے اور اندر پیوست ہوجاتا ہے۔

ڈاکٹر راسٹنڈ نے خیال کیا کہ ممکن ہے ان انڈوں میں ہلکا سا شگاف کردینے ہی سے نتیجہ برآمد ہوجائے اور مینڈک کے مادۂ تولید کی ضرورت نہ ہو، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور وہ اس میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن اس تجربہ کو زیادہ وسیع نہیں کیا گیا۔ تاہم جو بنیاد اس تجربہ کی پڑگئی ہے۔ اسے کسی نہ کسی دن وسیع ہونا ہے اور دُنیا میں متعدد سائنس داں ایسے پیدا ہوں گے جو اس کو تکمیل کی حد تک پہونچائیں گے۔

اگر یہ تجربہ ایسے جانوروں پر کامیاب ہوگیا جو انسان سے زیادہ مشابہ ہیں، مثلاً گوریلا بندر، تو یقیناً عورت پر بھی کامیاب ہوگا اور پھر نسل انسانی کا ایک نیا دور شروع ہوگا جسے ہم صحیح معنی میں مسیح کی نسل کہہ سکیں گے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ آیا عورتیں اس تجربہ کے لئے طیار ہوں گی یا نہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی ایک مثال بھی اس کی قایم ہوگئی تو یوروپ کی ہزاروں عورتیں جو اولاد سے محروم ہیں، یا اپنے شوہروں سے خوش نہیں ہیں اس تجربہ کے لئے اپنے آپ کو پیش کردیں گی۔

قدرت کی وسیع کارگاہ میں اگر شہد کی مکھیوں کی تولید پر نگاہ ڈالی جائے تو ہم کو اسی قسم کی عجیب بات وہاں بھی نظر آتی ہے۔ شہد کی مکھیاں پالنے والے واقف ہیں کہ ہر چھتے میں ایک ہی مادہ مکھی ہوتی ہے جسے یعسوب (شہد کی ملکہ) کہتے ہیں، اگر کوئی اور مکھی اتفاق سے پیدا ہوجاتی ہے تو اسے چھتہ سے باہر نکال دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنا چھتہ کہیں الگ جاکر بنائے۔ اس کے علاوہ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ موسم بہار میں یہ ملکہ کسی دن اپنے چھتہ سے باہر نکل جاتی ہے اور کسی نہ کسی پھول پر نر کو پالیتی ہے۔ جب نر اس سے ملتفت ہوتا ہے تو یہ اس کے عضو تولید کو نکال کر اپنے مادۂ تولید کے اندر چھپالیتی ہے اور نر مرجاتا ہے۔ اس کے بعد ملکہ اُڑکر پھر اپنے چھتہ میں جاتی ہے (جہاں مزدور مکھیاں پہلے سے چھتہ کے اندر سیکڑوں خانے بناکر طیار رکھتے ہیں) اور ہر خانہ میں ایک ایک انڈا دیتی ہے۔ پھر ان انڈوں سے بعض مکھیاں تو ایسی نکلتی ہیں جو نر کے مادۂ تولید سے پیدا ہوئی ہیں، بعض اس مادہ کی پیدا وار نہیں ہوتیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "تولید غیر جنسی" کا سلسلہ قدرت نے پہلے ہی سے جاری رکھا ہے اور ہوسکتا ہے کہ شہد کی مکھیوں کے علاوہ کسی اور مخلوق میں بھی جاری ہو۔

بہرحال "تولید غیر جنسی" کا یہ تجربہ نہ صرف بہت عجیب و غریب ہے بلکہ ہمارے مذہبی و اخلاقی اصولِ حیات میں بھی انقلاب پیدا کرنے والا ثابت ہوگا اور جذبات کی دُنیا میں اس سے جو ہلچل مچ جائے گی، وہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ یہ وہ وقت ہوگا جب دُنیا میں صرف عورت ہی عورت نظر آئے گی۔ جری، جفاکش، محنتی لیکن محبت سے بیگانہ، ہمدردی و رواداری سے معرّا۔ نہ اس کا دل کسی کے لئے دھڑکے اور نہ اسکی آنکھیں کسی کی جدائی پر آنسو بہائیں گے

# دعوتِ نقد و نظر

گزشتہ اشاعت میں " دعوتِ نقد و نظر" کے عنوان سے جو اعلان کیا گیا تھا اس کو دیکھ کر جناب نظیر صدیقی اور جناب اکرم دھولیوی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور انھیں بجنسہ پیش کیا جاتا ہے ۔ اکتوبر کا نگار سامنے رکھ کر ان کو ملاحظہ فرمائیے ۔
آیندہ مہینے دیگر حضرات کی رایوں کے ساتھ میں اپنی رائے بھی پیش کروں گا ۔ نیاز

---

## نظیر صدیقی)

" دعوتِ نقد و نظر" کا سلسلہ خوب ہے ۔ جدید تنقید میں حسن کاری اور فن کاری کے الفاظ کثرت سے استعمال جاتے ہیں لیکن ان کے مفہوم و مطالبات پر کم غور کیا جاتا ہے بلکہ حسن کاری اور فن کاری کی جو مثالیں پیش کیجاتی وہ بعض اوقات نقاد کے ذوق و بصیرت کو مشتبہ بنا دیتی ہیں ۔ مثلاً عہد حاضر کے ایک نہایت مشہور و ممتاز نقاد عہدِ حاضر کے ایک مشہور و مقبول شاعر کا یہ شعر حسن کاری کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے  عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

غرض کہ آج کل شعر کی فنی حیثیت پر اچھے اچھوں کی نظر بھی تنقید کا حق ادا نہیں کرتی ۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری شاعری کا معیار پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے ۔ بے اصولی اصول بنتی چلی جا رہی ہے اور بد مزاقی مذاقِ سلیم کی جگہ لیتی نظر آ رہی ہے ۔

آپ نے جو اشعار رائے زنی کے لئے پیش کئے ہیں وہ خواہ کتنے ہی مشہور و ممتاز شاعر کے نتائجِ فکر کیوں نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ناقص بھی ہیں اور گھٹیا بھی ۔ ان اشعار کے رنگ و آہنگ سے شاعر کا پتا چلانے میں بھی مدد نہیں ملتی ۔ اور یہ بھی ان اشعار کا بہت بڑا عیب ہے ۔

ان اشعار کو دیکھ کر سب سے پہلا تاثر جو ذہن میں قایم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے یعنی وہ جذبات و خیالات کے اعتبار سے قطعی نادار ہے ۔ نتیجتاً وہ الفاظ سے کھیلنے پر مجبور ہو گیا ہے ۔ ان اشعار میں نہ تو ایک تربیت یافتہ دماغ کی کاوشیں ہیں اور نہ کسی محبت زدہ دل کی دھڑکنیں ۔ چند رسمی اور روایتی مضامین کو شاعری کی شکل دیدی گئی ہے ۔ ان میں سے کوئی شعر ایسا نہیں ہے جس میں خیال یا بیان کی خامیاں موجود نہ ہوں ۔ اگر تمام اشعار پر عمل جراحی کیا جائے تو یہ تحریر "مالہ و ماعلیہ" بن جائے گی ۔ لہذا میں چند اشعار کی خامیوں کی طرف سرسری اشارے پر اکتفا کرتا ہوں ۔

پہلا شعر مفہوم کے لحاظ سے یکسر مہمل ہے ۔ محبت میں عاشق کا اپنے داغ دل سے کوئی امید وابستہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ داغ دل کو چراغ سے تشبیہ دینا بھی درست نہیں ۔ اس لئے کہ چراغ روشنی کی علامت ہے

اور داغ تاریکی کی علامت۔

دوسرے شعر میں "جوش مستی" کے الفاظ نے شعر میں قدرے ابتذال پیدا کر دیا۔ علاوہ ازیں شعر میں کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی۔

تیسرا شعر میں سمجھ ہی نہیں سکا۔ چوتھے شعر میں پھولوں کے کمھلانے کی جو تعبیر پیش کی گئی ہے وہ حسن تعلیل سے خالی ہے۔ دوسرے یہ کہ غزلخواں ہونا افسانۂ غم سنانے کا مترادف نہیں۔ "غزلخواں ہونا" نشاط و مسرت کی کیفیت کا اظہار ہے نہ کہ غم و الم کا بیان۔

پانچواں شعر شاعر کی بدمذاقی کا شاہکار ہے۔ اول تو یہ کہنا ہی بے تکا پن ہے کہ مجھے محبت میں آپ کا سا حسن چاہئے۔ یہ خیال اس وقت لطف دے سکتا تھا۔ جب دوسرے مصرع سے یہ پہلو نکلتا کہ چونکہ آپ کا سا حسن معدوم ہے لہذا میرے مطلوب و مقصود آپ ہی ہیں۔ دوسرے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ محبوب کا جمال بدر آسا داغ اور ہلال آسا زخم سے عبارت ہے۔ کس قدر مبتذل مضمون ہے یہ۔ اس شعر کا تیسرا نقص یہ ہے کہ پہلے مصرع میں لفظ "سا" بے محل ہے۔ اسے "آپ ہی کا" کے بعد آنا چاہئے تھا۔ یعنی "آپ ہی کا سا جمال"

ساتویں شعر کے دونوں مصرعے مربوط نہیں۔ پہلے مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ شاعر ہر وقت خمار و سرور میں مبتلا رہا کرتا تھا حالانکہ بیک وقت ان دو متضاد کیفیتوں میں مبتلا ہونا ممکن نہیں۔ جب "خمار" کے پہلے لفظ "اک" استعمال کیا گیا تو "سرور" کے پہلے بھی لفظ "اک" استعمال کرنا ضروری تھا۔

آٹھویں شعر میں شاعر کا مدعا واضح طور پر ادا نہ ہو سکا۔ پھر یہ کہ اس میں جو تعمیم ہے وہ قطعی غیر ضروری اور بے محل ہے۔

نویں شعر کو اگر لایعنی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دل، جان، سوز، ساز، ان تمام چیزوں کو راز سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے بعد شاعر کا یہ ادعا ہے کہ میرے ہمراہ کوئی راز نہ تھا۔ یعنی نہ تو ان کے پاس دل تھا، نہ جان تھی، نہ سوز تھا اور نہ ساز۔ اس قسم کا "میں ہی میں" نہ کبھی دیکھنے میں آیا اور نہ کبھی سننے میں "نہ تھا" نے یہ اُلجھن بھی پیدا کر دی ہے کہ آخر یہ شعر شاعر کی زندگی کے کس دور سے تعلق رکھتا ہے۔

دسویں شعر کو سمجھنے کے لئے صوفی ہونا پہلی شرط ہے اور میں اس شرط کو پورا کرنے سے عاری ہوں۔

گیارھویں شعر کا مطلب غالباً یہ ہے کہ میرا غم فرقت وہ بیان کرتے اور ان کا غم فرقت میں بیان کرتا۔ یعنی چہ؟

بارھویں شعر میں لفظ سیر کا استعمال قطعی مولویانہ اور غیر شاعرانہ ہے۔ اس شعر میں بھی کوئی کیفیت نہیں۔

تیرھویں شعر کا مضمون تو رسمی ہے، اس کے انداز بیان میں بھی کوئی جدت نہیں۔ بلکہ ایک اہم نقص یہ ہے کہ جیب و گریباں کو دو مختلف چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ درانحالیکہ جیب و گریباں ہم معنی الفاظ ہیں۔

چودھویں شعر کے پہلے مصرع میں لفظ "دل" صرف وزن پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، ورنہ اس کی ضرورت ہرگز نہ تھی۔ جس طرح درد کو درماں کہا گیا ہے زخم کو مرہم کہنا کافی تھا۔ اور اگر مرہم کے ساتھ لفظ دل لانا ہی تھا تو "درماں" کے ساتھ بھی اسی قسم کا کوئی لفظ استعمال کرنا چاہئے تھا۔

اٹھارھواں شعر معنوی اعتبار سے ناقص ہے۔ "میں نے جس دل کی طرف دیکھا" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا

کیونکہ کوئی کسی کے دل کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتا۔ البتہ چہرہ کی طرف دیکھ سکتا ہے۔ آنکھ کی طرف دیکھ سکتا ہے۔
انیسویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں تعقید ہے۔ "راز" اور "میخانے" کے درمیان کافی بعد پیدا ہوگیا ہے۔
بیسویں شعر کا مطلب میری سمجھ سے بالاتر ہے۔
اکیسویں شعر میں برقِ جمالِ یار کے لئے "برسنا" استعمال کیا گیا ہے۔ برق کے لئے برسنے کے بجائے گرنا استعمال کرنا چاہئے تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ برقِ جمالِ یار کا نظارہ کسی کے مزار پر کیوں کیا گیا۔ شاعر صاحب یہ بھی تو بیان کرسکتے تھے کہ خود ان کے دل پر برقِ جمالِ یار کا کیا اثر پڑا۔
تیئیسویں شعر میں مبالغہ غلو کی حد تک پہونچ گیا ہے جس کی وجہ سے شعر لایعنی بن کر رہ گیا ہے۔
چوبیسویں شعر میں "سوز و ساز کے ساتھ" تھا" استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ سوز و ساز دو مختلف چیزیں ہیں لہذا "تھے" استعمال کرنا چاہئے تھا۔
چھبیسویں شعر میں نہ جانے کس کے "اندازِ فغاں" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ویسے شعر کا مطلب بھی واضح نہیں۔

---

## (اکرم دھولیوی)

۱- داغ دل سے کیا امید تھی یہ ظاہر نہیں کیا، اگر روشنی کی امید تھی تو پھر مصرعۂ ثانی بے محل ہے۔ کیونکہ چراغ سحری کے گل ہوجانے کے بعد تو روشنی خود ہوجاتی ہے، لہذا استعارہ درست نہ ہوا۔ چراغ سحری کی جگہ چراغِ سحر بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔
۲- شعر اچھا ہے لیکن مصیبت میں آنا محاورہ نہیں، مصیبت میں پڑنا محاورہ ہے، ثانی مصرعہ یوں ہوسکتا تھا "مصیبت کی زد میں نقاب آگیا" بند نقاب یوں بھی یہاں ٹھیک نہیں صرف نقاب چاہئے۔
۳- دامن کا گریباں ہونا خود پردہ دری کی بات ہوئی، یہ تو افشائے راز ہوا، پھر پردہ کہاں رہا؟
۴- مصرعہ ثانی کے لفظ "مجھے" نے دوسرے مصرع کو پہلے سے الگ کردیا۔ "مجھے" کی جگہ "انھیں" چاہئے۔ غزلخواں کہنے کا بھی یہ محل نہیں نالاں کہنا چاہئے تھا۔
۵- جب آپ ہی کا جمال سا چاہئے تو پھر بدر یا ہلال کب جلوۂ محبوب کی ہمسری کرسکتے ہیں؟ ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ گویا معشوق کا جمال بدر سا داغدار اور ہلال سا خمدار ہے۔
۶- ردیف "ہوجانا" یہاں چسپاں نہیں۔ "ہونا" کا محل ہے۔ "سہل سمجھتے تھے" سے بھی تکلف کی بو آتی ہے اس کے علاوہ یہ کہ بند نقاب کھل جانے کے بعد بھی تو پابندیِ حیا باقی رہ سکتی ہے یہ سراسر معنوی نقص ہے۔ کیونکہ بند نقاب مرئی اور حیا غیر مرئی ہے۔
۷- قافیہ سے مجبور ہوکر دلِ ناصبور لکھا گیا جو خمار اور سرور کے مقابل قطعی ناموزوں ہے، ہر وقت کی جگہ ہر لحظہ ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔
۸- چھپا ہوا نشتر کی جگہ امید کا نشتر ہوتا تو خیر کوئی بات تھی۔ کیونکہ صرف چھپا ہوا نشتر کہنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر معشوق عاشق کے دل کو لطف سے اپنا نہ بنالیتا تو اس میں چھپا ہوا نشتر ضرور اس کے خلاف مستعمل ہوتا اور اس خیال کی سبکی ظاہر ہے۔ شعر میں تقابل قوافی کا عیب بھی موجود ہے۔

---

۹- "دل نہ تھا جان نہ تھی سوز نہ تھا ساز نہ تھا" یعنی میں ہی میں تھا یہ تو اک طرح کی راز کی بات ہوئی پھر "کوئی راز نہ تھا" کیا معنی ؟ زبان کے لحاظ سے "مرے ہمراہ" بھی یہاں ٹھیک نہیں مری بستی میں یا مری دُنیا میں کوئی راز نہ تھا کہنا چاہئے تھا۔

۱۰- اگر وعدۂ دیدار کی جگہ انتظار دید ہوتا تو شعر کا مطلب واضح ہوجاتا۔ بہت رو کا پھر بھی اچھا ٹکڑا نہیں

۱۱- "خلوت میں غمِ فرقت" کی بجائے "اے کاش غمِ اُلفت" ہوتا تو شعر سطح سے بلند ہوجاتا۔

۱۲- "آنسو بھی رواں ہوتے" کہنے کے بعد بھی یہ شعر حدود تغزل میں نہ آسکا پھر کس کے آنسو یہ ایک سوال بھی باقی رہ جاتا ہے۔ اگر عاشق کے آنسو مراد لئے جائیں (اور مطلب بھی یہی ہے) تو پھر یہ کہ ان کو دریا کی روانی کے ساتھ کیا علاقہ ہے ؟

۱۳- جیب عربی اور گریبان فارسی معنی دونوں کے ایک ہیں۔ ایک طرف دامن ہوتا تو درست تھا۔

۱۴- زخم کو صرف مرہم چاہئے۔ مرہم دل نامناسب ہے خوب کہکر طنز کا بھی یہاں کوئی موقعہ نہیں، کیونکہ اگر طنز سے کام لیا گیا تو پہلے مصرع کی بات ختم ہوجائے گی۔ یعنی چارہ گر یہ کیا سمجھا۔ درانحالیکہ معاملات محبت میں عاشق خود درد کو درماں اور زخم کو مرہم سمجھتا ہے لہذا ثانی مصرع یوں چاہئے :-

"چارہ گر آج علاج غم پنہاں سمجھا"

۱۵- یہ عمدہ شعر ہے مگر پہلے مصرعہ میں سوختہ ساماں کی جگہ بے سروساماں چاہئے

۱۶- یہاں عشق کا قاف بُری طرح گر گیا۔ "رگ رگ میں تیرِ نظر دیکھا" غلط ہے پایا چاہئے کیونکہ مقصود بیان صرف کیفیت کا اظہار ہے۔

۱۷- یا اور نون کا اضافہ فارسی الفاظ میں ہوتا ہے۔ غزال عربی ہے اس لئے چشم غزالیں درست نہیں۔ اس کے علاوہ پہلے مصرع میں میخانہ کا ذکر ہے بنابریں ثانی مصرع میں فردوس کی جگہ اسی قبیل سے کوئی لفظ چاہئے تھا۔

۱۸- اگر نگاہ یاس کی جگہ نگاہ شوق ہوتا تو واقعی مصرعۂ ثانی پر پُرلطف ہوجاتا "جس دل کی طرف دیکھا" کی بجائے جس "شے" کی طرف دیکھا میں معنویت زیادہ تھی۔

۱۹- "جب تو کچھ" یہاں زبان کے لحاظ سے ٹھیک نہیں اس کے علاوہ "اے دل" کہنے کے بعد پیمانہ کہنا بھی تکلف سے خالی نہیں۔ لہذا مصرعۂ ثانی یوں چاہئے "ظرف عالی ہو جو میکش ترے پیمانے کا"

۲۰- "نبض کی رفتار ہوجانا" میں تصنع ہی تصنع ہے، شاعر کا مطلب یہ تھا کہ درد ہی خود نبض میں جاری و ساری ہے اس لئے چارہ گر کو نبض ڈوبی ہوئی نہیں معلوم ہوتی مگر موجودہ الفاظ سے یہ مطلب ادا نہیں ہوتا۔ "درد کے ہوتے" نے شعر کو اور خراب کردیا مطلب یہ کہ اگر درد نہ ہوتا تو رازِ غم چارہ گر پر کھل جاتا مگر کوئی یہ پوچھے کہ بغیر درد کے غم کہاں ؟

۲۱- برس گئی اتنا ٹھیک نہیں جتنا برس پڑی۔ اس کے علاوہ زمانہ کے لحاظ سے مصرعۂ ثانی میں "ہے" کی جگہ "ہوگیا" چاہئے۔ مزار بھی غلط ہے۔ اس کی جگہ "خاک" لکھنا چاہئے تھا کیونکہ برق گرنے کے بعد عاشق کا خاک ہوجانا قرینِ قیاس ہے۔

۲۲- آنسو کا قطرہ زمین پر گرنے کے بعد مٹی میں مل جائے گا حُسن کا دریا نہیں ہوسکتا اگر اس مبالغہ سے

۲۳- محشر کے معنی ہیں جائے حشر، اس لئے یہ لفظ یہاں غلط مستعمل ہوا ہے، اس کے علاوہ خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری تو ہو سکتی ہے مگر بھڑکا ہوا شعلہ نہیں ہو سکتا۔

۲۴- رگ رگ میں دل تھا یہ ٹکڑا محلِ نظر ہے اگر دل سے مراد سوز و ساز ہے تو پھر دوسرا ٹکڑا بیکار ہو جاتا ہے۔

۲۵- پہلے مصرعہ کو دوسرے سے کوئی لگاؤ نہیں دوسرے کو یوں ہونا چاہئے تھا

"نظروں کو اُٹھا کر رخِ جاناں نہیں دیکھا"

۲۶- مطلب شاعر کا یہ تھا کہ نالۂ بلبل میں اگر میرا انداز فغاں بھی شامل ہوتا تو سارا چمن بلبل کی ہمنوائی کرتا مگر شعر کے الفاظ اس معنی کو ادا کرنے سے قاصر ہیں "میرا" کے بعد "بھی"۔ درست نہیں "بھی" اندازِ فغاں کے بعد چاہئے تھا۔ صرف بلبل کی زباں کہکر نالہ سرائی مراد لینا درست نہیں۔ "چمن میں ہر لبِ خاموش" یہ ٹکڑا بھی بے محل ہے۔ مصرعۂ ثانی یوں ہوتا تو شعر درست ہو جاتا:-

"چمن سب ہمنوائے عندلیبِ نوحہ خواں ہوتا"

---

## فضا میں خلاء نہیں ہے

جس وقت ہم رات کو آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے لیکر ستاروں تک خلاء ہی خلاء ہے اور فضا بالکل صاف ہے، لیکن در اصل ایسا نہیں ہے، ایک نہایت ہلکا و لطیف مادہ اس خلا میں بھرا ہوا ہے، اس کا کچھ حصہ تو وہ ہے جو سورج اور ستاروں کی انفجاری (EXPLOSIVE) حرارت سے پیدا ہوا ہے اور کچھ حصہ وہ ہے جو فضا کی آتشی ذرات کے باہمی تصادم سے پیدا ہوتا رہتا ہے۔

## فضا کی وسعت

رات کو جو ستارے ہم کو نظر آتے ہیں، ان کا شمار بڑی بڑی دوربینوں سے کیا جا رہا ہے لیکن ان کی پوری تعداد معلوم کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ ان میں ہر ایک ستارہ اپنی جگہ ایک مستقل کرہ ہے ایک مستقل دُنیا ہے جس کی روشنی ہم تک پہونچتی رہتی ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ روشنی ہم تک کتنے عرصہ میں پہونچتی ہے۔

روشنی کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہے۔ اور ہم سے جو ستارہ سب سے زیادہ قریب ہے، اس کی روشنی بھی ہم تک چار سال تین مہینے میں پہونچتی ہے، چہ جائیکہ دور کے وہ ستارے جن کی روشنی لاکھوں سال بعد ہم تک پہونچتی ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ فضا کی وسعت کتنی ہے جس میں اس قسم کے بیشمار ستارے موجود ہیں۔

## سورج کے شعلے

سورج ایک مشتعل کرہ ہے جس سے ہر وقت شعلے نکلتے رہتے ہیں، لیکن یہ شعلے کس قدر ہیبت ناک اور کتنے بڑے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض شعلوں کی بلندی ۸۰ ہزار میل ہے اور یہ جس رفتار سے بلند ہوتے ہیں وہ دو لاکھ میل فی گھنٹہ ہے سورج سے جو گرمی پیدا ہوتی ہے وہ ایک منٹ میں ۳۷ ہزار ٹن پانی میں ابال پیدا کر سکتی ہے اور اگر زمین کے چاروں طرف ۳۸ گز کی دبیز چادر برف کی بچھا دیجائے تو ایک سال کے اندر سورج کی گرمی اسے پگھلا کر رکھدے۔ اس کی روشنی چاند کی روشنی سے ۵۷۰۰۰۰ گنا زاید ہے۔

# جہانِ منتظر

یہ دُنیا کس تباہی میں ہے مصروف
نہ ہو جائے دماغِ عصرِ ماؤف،
یہ دُنیا یہ سوادِ تشنہ کامی،
دیارِ سازہ برگِ نا تمامی،
یہ دنیا یہ کمالِ نامکمل
کہیں اور، ایسی دُنیا سے نکل چل

جہاں کانٹے نہ ہوں پھولوں میں پیوست
فلک جس کا زمیں سے بھی نہ ہو پست
شگوفوں پر نہ لہرائے کڑی دھوپ
نہ سنولائیں گل و گلزار کے روپ
کلی، لطفِ صبا کی ہو نہ محتاج
دبائیں سنگ ریزوں کو نہ پھر اج
خزاں میں ہو نہ پھولوں کی سحر گم،
اندھیرے کو نہ پوجیں ماہ و انجم
نہ سلگیں چاند کے سینے میں ناسور
گل و نسریں نہ ہوں صرصر کے مقہور،
ستارے صبح کی لو سے نہ پگھلیں
شعاعیں خون شبنم کا نہ چوسیں
کرن ایسی نہ ہو خورشید کے پاس
کہ جس سے ٹوٹ جائے صبح کی آس،
اُجالے دیں نہ ظلمت کی گواہی،
نہ رسوا ہو جمالِ صبحگاہی ،،
کلاہیں اہلِ باطل کی نہ ہوں کج
شفق کی آگ میں جھلسیں نہ سورج
کدورت ہو نہ آئینوں کا مشرب
نہ تلخابی ہو نوشینوں کا مذہب،
نہ کھینچے غم دلوں پر یاس کے خط
نہ ذہنوں پر ہو تاریکی مسلّط ،
نہ گزریں شرم سے منہ ڈھانپ کر چاند
نہ ہوں روشن ضمیری کے دئے ماند
نہ توڑے سنگ آئینوں کے فانوس
نہ بازاروں میں بکنے جائیں ناموس
نہ ہوں دین و وطن نیلام کا مال
نہ ہوں دو رکعتیں معراجِ اعمال،
حرم ہو اپنے مُلّا سے نہ نادم
نہ ابراہیم ہوں آذر کے خادم
بنامِ عظمتِ توریت و انجیل،
گناہیں ہوں عبادت میں نہ تبدیل
نہ ہو یہ کائناتِ مرغ و ماہی
ہلاکِ عشوۂ عالم پناہی
جہاں انساں نہ کرتے ہوں خدائی
جہاں ہو دولتِ صلح و صفائی،
جب ایسا اک جہاں تعمیر ہوگا
تو میرے خواب کی تعبیر ہوگا

فضا ابن فیض اعظمی

# بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

آ رہا ہے سامنے سے دیکھو اک "خیر البشر"
بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

کچھ نظر محوِ تفکر ہونٹ کچھ ہلتے ہوئے
کفر و ایماں زندگی کی راہ میں ملتے ہوئے

یہ نفس کی بے قراری یہ نظر کا اضطراب
زہد و تقویٰ بھی مسلم بتگری بھی کامیاب

"سامریت" "موسیّت" کے ساز پر گاتی ہوئی
ایک جنّت جس میں دوزخ پرورش پاتی ہوئی

روشنی کے راستے پر تیرگی چلتی ہوئی
موت کے پہلو میں شمعِ زندگی جلتی ہوئی

راہزن ہے جادہ پیما رہنما کے بھیس میں
کفر کی ہے سلطنت قدوسیت کے دیس میں

لے رہی ہے شانِ کعبہ کروٹوں پر کروٹیں
کٹ رہی ہیں آج سلمائے شریعت کی لٹیں

کھیل کھیلا جا رہا ہے جانے کیا کیا سوچ کر
ہنس رہی ہے اب مسرت غم کے گیسو نوچ کر

بیٹھتے ہیں آگ کے شعلے دھوئیں کی چھاؤں میں
ایک کانٹا چبھ گیا ہے راستی کے پاؤں میں

زیست سایہ ڈھونڈتی ہے چلچلاتی دھوپ میں
اہرمن آکر کھڑا ہے آدمی کے روپ میں

ساقی فاروقی

## دھولیوی :

امید التفات نے رسوا کیا مجھے
حاشا کہ آپ سے نہیں کوئی گلا مجھے،

کھانے دے دشت ہی کی کوئی دم ہوا مجھے
اے دل کہیں سکون تو آئے ذرا مجھے

ہے کوچۂ جنوں، میں وہی کاروبارِ شوق
اب تک سنائی دیتی ہے آوازِ پا مجھے

یہ بے کسی کہ اپنے سوا کائنات میں!
آتا نہیں نظر کوئی اب دوسرا مجھے

مہجوری چمن کی شکایت سے فایدہ
راس آگئی قفس کی بھی آب و ہوا مجھے

کیا جانے میری زیست میں کل کیا ہو انقلاب
کرنے دے اے دل آج کوئی فیصلا مجھے

## نظیر صدیقی :

اک درد لاعلاج سہی، زندگی مگر
بنتی نہیں ہے درد کا درماں کئے بغیر

ناکام عشق سے بھی زیادہ ہیں بدنصیب
جو لوگ جی رہے ہیں محبت کئے بغیر

نظیر کچھ ایسے تجربے بھی جہاں میں ہوتے ہیں آدمی کو
کہ بن پڑے تو وہ ان کو خود اپنے آپ سے بھی چھپا کے رکھے

رہِ حیات کے وہ تجربے معاذاللہ
چھپا کے رکھنا پڑا جن کو رازداروں سے

امیدوں کے چراغ ایک ایک کر کے بجھ گئے آخر
مگر یہ کیا کہ بزمِ آرزو برہم نہیں ہوتی

بے سبب جی نہیں نڈھال اپنا
پھر کہیں دل نے چوٹ کھائی ہے

کیا کہوں کیا گزر گئی دل پر
جب کبھی تیری یاد آئی ہے

آخر تمہیں بتاؤ کہ یہ ماجرا ہے کیا،
نزدیک آکے اور بھی تم دور ہو گئے

وہ نگہ گو غلط انداز سہی، پھر بھی نظیر
ایک نعمت ہے دلِ تشنۂ الفت کے لئے

# قلق کی غیر مطبوعہ رُباعیاں

وہ وقتِ شباب وہ زمانہ نہ رہا
وہ نشۂ مستی وہ ترانہ نہ رہا
آتا تھا کہانی کا مزہ باتوں میں
اب اپنے سوا کوئی فسانہ نہ رہا

---

یاں نفس کی شوخی سے ہے مجنوں لیلا
قانع ہے تو مت بہرِ نفی کہنا لا
کر شرم ذرا قلق دُعا سے پہلے
ہاتھوں کا اُٹھانا بھی تو ہے صورتِ لا

---

دُنیا کا تمام کار خانہ ہے عبث
اس کشتِ عبث کا دانہ دانہ ہے عبث
اک حرفِ غلط ہے بلکہ یہ بھی ہے غلط
ہر ذکر عبث ہے ہر فسانہ ہے عبث

---

تیرا ہے جہاں خالقِ یزداں محتاج
دانا محتاج اور نادان محتاج
حاجت ہے اگر کسی کی تو تجھسے ہو
لیکن نہ ہو انسان کا انساں محتاج

---

افسانۂ یار بہرِ وصلت ہے لذیذ
پیمانۂ مے پئے فراغت ہے لذیذ
اے شیخ ہے ہر وقت تو روکھا پھیکا
یہ طرفہ مذاق ہے کہ طاعت ہے لذیذ

---

ویراں کدۂ دہر میں تعمیر نہ کر
داغِ صد سنگ و خشت سینہ پہ نہ دھر
اس نکتۂ معمار سے کر فکرِ مآل
رکھتا ہے نکلنے کے لئے پہلے در

---

ہر فصل میں ہوتے ہیں جواں سارے شجر
ہر سال نئے پھولتے پھلتے ہیں ثمر
انساں کی کوئی فصل نہ پھر کر آئے
اول ہی کا جھونکا ہے بہارِ آخر

---

مسجد کو دیا چھوڑ ریا کی خاطر
کعبہ نہیں جاتا تو حیا کی خاطر
میخانہ میں جاتا ہوں تو رحمت کے لئے
مے پیتا ہوں احسان خدا کی خاطر

---

کہتا ہوں خدا لگتی عقیدے کے خلاف
ہے تیرا خطا وار سزاوارِ معاف
ہے رحم ہی شایانِ خدائی تجھ کو
انصاف یہی ہے کہ نہ کرنا انصاف

---

یہ حال بتر رحم فزا ہے کہ نہیں
اس زیست سے مرنا ہی بھلا ہے کہ نہیں
سنتا ہی نہیں، کہئے کسی صورت سے
یارب تو ہمارا بھی خدا ہے کہ نہیں

---

بدمستیِ دوشینہ جو یاد آتی ہے
خود رفتگی قابو سے نکل جاتی ہے
ہے یادِ شبِ وصل و سحر خواب و خیال
اک لمحہ میں دُنیا ہی بدل جاتی ہے

---

ایجادیِ خالق کا ثمر ہے ہستی
امید دو عالم کی سحر ہے ہستی
سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں آخر کار
بے خبریٔ مطلق کی خبر ہے ہستی

---

اے صلِ علیٰ سوز ترا حسن و جمال
یہ مہر میں خوبی ہے نہ یہ مہ میں کمال[1]
کاہش کے سوا کچھ نہیں افزایش میں
تو بارہ برس کا رہے یارب صد سال

**عابد رضا خاں بیدار**

---

[1] عبدالکریم سوز پسر امام بخش صہبائی، ۲۳ سال کی عمر میں ۱۲۷۴ھ میں گوروں کے ہاتھوں شہید ہوئے

# مطبوعات موصولہ

**ہائے رنگ رنگ** مجموعہ ہے جناب رادھے شیام رستوگی (انگریزی لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی) کے اُردو و فارسی کلام کا جسے غالباً خود انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ نفیس کاغذ پر ع کیا ہے۔ ضخامت ۱۶۸ صفحات، سائز ۲۰ × ۲۶/۸ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ :۔ کتب خانہ دانش محل ولہ پارک لکھنؤ۔

رادھے شیام صاحب لکھنؤ ایک قدیم معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ اس دور کی یادگار ہیں، جب سلمان دونوں کی تعلیم ایک ہی مکتب میں ہوتی تھی اور دونوں ملکر ایک مشترکہ زبان و کلچر بنا رہے تھے، رادھے شیام صاحب میں بھی اُردو فارسی کا ذوق بہت کمسنی سے پیدا ہوا اور بی، اے تک اختیاری فارسی ہی اختیار کیا۔ اس لئے تعجب کی بات نہیں اگر اس ذوق کے تحت رفتہ رفتہ ان کے کلام نے لی صورت اختیار کرلی۔

اس مجموعہ کا پہلا حصّہ اُردو غزلوں پر مشتمل ہے اور دوسرا اُردو منظومات، رباعیات و قطعات پر، تیسرے ں فارسی کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ ان کی اُردو غزلیں قدیم کلاسکل رنگ کی ہیں، جن میں صحتِ خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے لکھنؤ میں پرورش پائی اور یہیں کی زبان وں نے اول اول لکھنا پڑھنا سیکھا۔ چنانچہ وہ خود اک جگہ لکھتے ہیں :۔

سخن دانوں دانوں سے صحبت ہے، زباندانوں میں رہتے ہیں"۔ نظموں میں اصلاحی رنگ غالب ہے سی نظموں میں وطن پرستی کا وہی جذبہ پایا جاتا ہے جو چکبست مرحوم کے یہاں پایا جاتا تھا۔ ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اساتذہ کے کلام کا فی مطالعہ کیا ہے اور اس سے بڑی حد تک مستفید یں۔ فارسی میں نوحۂ سردار بھگت سنگھ، ڈاکٹر ٹیگور بڑی اچھی نظمیں ہیں۔ ابتداء میں پروفیسر مسعود حسن ا تعارف اور پروفیسر سرور کا تبصرہ بھی شامل ہے۔

**وحشت حصۂ اول** مجموعہ ہے جناب رضا علی وحشت کے کلام کا جسے مکتبۂ جدید لاہور نے نہایت اہتمام سے بہترین کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۲۷۲ صفحات، سایز ۲۰×۲۲/۱۶ ھ روپیہ وحشت دور متوسط کے شاعر ہیں، اور جن کا شمار اسی وقت اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا، جب لی اور اقبال زندہ تھے۔ اور نظم طباطبائی، اکبر الہ آبادی اور ظہیر دہلوی ایسے اساتذہ سے دادِ سخن ے۔ کلکتہ میں چونکہ فارسی تعلیم کا رواج فورٹ ولیم ہی کے زمانہ سے شروع ہوگیا تھا۔ اس لئے وحشت ئی تعلیم بھی فارسی ہی میں ہوئی اور بعد کو ان کا یہی ذوق اُردو میں بھی منتقل ہوگیا، چنانچہ ایک جب رنگ غالب کے شاعروں میں انھیں اور وفا رامپوری کو خاص شہرت حاصل تھی۔ غالب سے کرنے کا ذکر خود انھوں نے بھی کیا ہے :۔

سخت آموخت غالب از نظیری وحشت از غالب  چراغے راکہ دودے ہست از سر زود در گیرد،

رنگِ غالب کا مفہوم عام طور پر اس کی دقت آفرینی و مشکل پسندی قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ غالب کا اصلی
صرف انداز بیان کی ندرت و شوخی تھی اور یہی وہ چیز تھی جو وحشت کے ابتدائی کلام میں نہیں نظر آتی تھی
بعد کو مشق و ممارست کے بعد اس میں وہ چیز بھی پیدا ہوگئی جسے حلاوت و شیرینی اور دل میں چبھ جا
والی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مثلاً :-

کیا تھا روح غالب سے جو میں نے کسب فن وحشت — سخنور سیکھتے ہیں آج اندازِ بیاں مجھ سے
مجھے ہے ناز اپنی زندگی پر ہے جس کی بنیاد درد ہی پر — بڑی ہی توہین درد ہوگی اگر درد کی دوا ملے گی
سرِ محفل چرانا آنکھ کا تھا، ایک افسانہ — وہ تو نے کہہ دیا خود جو نہ ہو سکتا بیاں مجھ سے
گئے وہ دن جب کہ اس چمن میں ہوائے نشو نما تھی ہم کو — خزاں کو دیکھا نہیں ہم نے؟ جو خواہشِ رنگ و بو کریں گے

وحشت کا فارسی کلام بھی اپنی جگہ خاص چیز ہے اور استادانہ رنگ سے خالی نہیں۔ بعض اشعار ملاحظہ ہو

از دلِ آشفتۂ خویشم خبر نبود مرا — اینقدر دانم کہ زلفش را پریشاں دیدہ ام
ہزاراں لطف پنہاں می شود از ہر ستم پیدا — تو طرزے کردۂ اے شوخ در بیداد ہم پیدا
فریاد ز جوشِ گریہ وحشت — ایں سیل مرا خراب خواہد

اس مجموعہ کے اخیر میں جناب وحشت کے عنفوان شباب کا کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے جو ۱۹۱۰ء
میں شایع ہوا تھا اور جس میں رنگ غالب زیادہ نمایاں تھا۔

اس کلیات میں ان کے وہ قطعات و مسدسات وغیرہ بھی شامل ہیں جو انھوں نے مختلف تقریبوں
میں اور تہنیت کے طور پر کہے ہیں، حالانکہ ان کی اشاعت ضروری نہ تھی۔

**شعلۂ گل** مجموعہ ہے احمد ندیم قاسمی کی نظموں اور غزلوں کا جسے قومی دارالاشاعت لاہور نے بڑے اہتمام کے ساتھ
نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے۔ سایز ۲۰ × ۲۶/۸ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت پانچ روپیہ

ندیم قاسمی اس عہد کے جوان شاعروں میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، قدیم
کلاسکل ٹکنک کے بھی شاعر ہیں اور جدید رنگ کے بھی۔ لیکن ان کا کلام پڑھنے کے بعد خواہ وہ کسی رنگ کا ہو، ہم یہ
ضرور محسوس کرتے ہیں کہ وہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جو پہلے ہمارے کانوں میں نہ پڑی تھیں — وہ ان شاعروں میں سے
ہیں جنھیں زمانہ کے اقتضاء نے پیدا کیا اور جنھوں نے زمانہ کے اقتضاء کا ساتھ دیا۔ وہ ابھی نوجوان ہیں، لیکن فکر و احساس
کے لحاظ سے کافی کہن سال، اور اسی لئے ہمیں ان کی شاعری میں جلال و جمال دونوں کا بڑا اچھا امتزاج نظر آتا ہے۔

عہدِ حاضر کے دوسرے شاعروں کی طرح اظہار خیال کے لئے وہ بھی نئے زاویوں کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن ان کے
زاوئے زیادہ تر خطوط مستقیم سے بنتے ہیں، خطوط منحنی سے نہیں اور اسی لئے وہ زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی بعض
جدید رنگ کی نظموں کا ٹکنک تو میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ فنی اصول سے آزاد رہنے کے بعد
بھی ہم ان کے مفہوم سے پورا لطف اٹھا سکتے ہیں اور آزاد شاعری میں اگر محض خیال کی بلندی و ندرت ہی کا التزام ملحوظ رہے
تو بھی غنیمت ہے۔ نظموں میں جہاں کہیں انھوں نے کلاسکل ٹکنک کو بھی قایم رکھا ہے وہاں ان کی شاعری انتہائی عروج
پر پہونچی ہوئی نظر آتی ہے ان کی ایسی نظموں میں "رفتار زمانہ" اور "جشن چراغاں" بڑی اچھی نظمیں ہیں۔ غزلوں کا
حصہ یکسر کلاسکل ٹکنک کا ہے، لیکن کلاسکل خیال کا نہیں اور اس کے ہر ہر شعر میں ہم کو نئی روشنی کی جھلک نظر آتی ہے
جو فکر و احساس کے لحاظ سے بڑی دلکش ہے۔

## ت نیاز

ن حصوں میں)
ر کے تمام وہ خطوط
ت نگاری، سلاست
گینی اور ایسلے
الحاظ سے فن انشاء
ں پہلی چیز ہیں اور
سامنے خطوط غالب
یکے معلوم ہوتے
اڈیشنوں میں پہلے
لطیوں کو دور کیا گیا
ڈے کاغذ پر طباعت
ت ہر حصہ کی چار روپیہ
اوہ محصول

## ت ایدہ

ازفتحپوری۔ اس کے
ے ایک شخص انسانی
ناخت اور اس کی
و دیکھ کر اپنے یا دوسرے
ے مستقبل، سیرت
وال، موت و
حت و بیماری
دینکنامی پر صحیح
گوئی کر سکتا ہے

قیمت

ے روپیہ

اوہ محصول

## شہناب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

## جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے اُن کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں بھی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بیمثل نمونے نظر آتے ہیں قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

## فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:—

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مادیئں کا مذہب نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

## شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی تازہ ایڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین قیمت ۱۲ر علاوہ محصول

## نقاب اٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت ۸ر علاوہ محصول

## مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

## انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے۔

ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد فنون دیبہ و حقیقت نگاری قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

## مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

# نگار کے خاص نمبر

## سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

## جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

## فروری، مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل ق
اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

## جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

## جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے
کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ
باسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور
اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

## جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۲۸ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اسمیں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

## جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں تاریس ہنڈس کی مشہور عالم
کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جسمیں اس نے ایران عصر
عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ و القص
زبوں حالی اور انکے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتا
ہے کہ انکا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں سالنامہ کا دو
حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جسمیں پہلی جنگ کبیر مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکی سب
کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

## سالنامہ سنہ ۱۹۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر قدر ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اسکا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

## سالنامہ سنہ ۱۹۵۳ء

(داغ نمبر) جسمیں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے
گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور
قیام حیدرآباد و زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور
انکے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو

## سالنامہ سنہ ۱۹۵۴ء

(فرمانروایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جسمیں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں
کے عروج و زوال کے اسباب بتائے گئے ہیں۔ یہ سالنامہ دراصل ایک تاریخی کتاب ہے جو ہر
لکھے پڑھے کے پاس ہونا چاہئے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول